تاریخ کی مُراد

ان اکابرین کا تذکرہ جن پر تاریخ فخر کرتی ہے

صاحبزادہ خورشید احمد گیلانی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

تاریخ کی مراد

سید خورشید احمد گیلانیؒ

خورشید گیلانی ٹرسٹ

H-22 مرغزار آفیسرز کالونی ملتان روڈ لاہور

فون: 5412005

جملہ حقوق بحق مصنف محفوظ

نام کتاب: تاریخ کی مُراد
مصنف: صاحبزادہ خورشید احمد گیلانی
سرورق: نعیم احسن
اشاعت اوّل: 2001

فہرست

پیش گفتار	سیّد ارشاد احمد عارف	5
1- امت کا پہلا ''صوفی'' (حضرت ابو بکر صدیقؓ)		9
2- مُرادِ نبوت (حضرت عمر فاروقؓ)		16
3- حضرت علیؓ، شہر حکمت کے باب عظیم (حضرت علیؓ)		21
4- امام حسینؓ ۔۔۔ ایک منفرد شخصیت (حضرت امام حسینؓ)		30
5- آزادی وانقلاب کے امام (حضرت امام حسینؓ)		35
6- امام اعظمؒ ۔۔۔ مجتہد اور مجاہد (امام اعظمؒ)		39
7- خاورِ تصوف کے رخشندہ آفتاب (شیخ عبدالقادر جیلانیؒ)		46
8- محمد بن قاسم ۔۔۔ محسن سندھ (محمد بن قاسم)		53
9- فرد فریدؒ (حضرت بابا فرید گنج شکرؒ)		59
10- گردن نہ جھکی جس کی جہانگیر کے آگے (حضرت مجدد الف ثانیؒ)		66
11- شاہ ولی اللہؒ ۔۔۔ نابغۂ عصر (شاہ ولی اللہؒ)		73
12- سفیر عشق رسولؐ (امام احمد رضا خان بریلویؒ)		80
13- اب انہیں ڈھونڈ چراغِ رخ زیبا لے کر (امام احمد رضا خان بریلویؒ)		86
14- سید جمال الدین افغانیؒ اور اتحاد عالم اسلامی (سید جمال الدین افغانیؒ)		94

15- حیران کر دینے والی شخصیت (سید جہانگیر اشرف سمنانی ؒ) 107
16- ''جنید وقت'' (حضرت حافظ محمد صدیق ؒ) 113
17- فقیہہ اعظم (مولانا نوراللہ بصیر پوری ؒ) 119
18 ہفت رنگ ہیرا (پیر جماعت علی شاہ ؒ) 125
19- ''حکیم الامت'' (علامہ اقبال ؒ) 131
20- نہ شیخ شہر، نہ شاعر، نہ خرقہ پوش اقبال ؒ (علامہ اقبال ؒ) 137
21- قائداعظم ؒ اور ہم (قائداعظم محمد علی جناح ؒ) 144
22- شہید محبت (غازی علم الدین شہید ؒ) 151
23- شاہ عبدالعلیم صدیقی ؒ -- پاکستان کے عاشق حقیقی (شاہ عبدالعلیم صدیقی ؒ) 156

پیش گفتار

تاریخ ان لوگوں کی احسان مند ہے جنہوں نے اپنی جدوجہد، نیک نیتی، خدا ترسی، جرات و استقامت، انسان دوستی اور جذبہ ایثار و قربانی کی وجہ سے اس کا چہرہ روشن کیا اور مختلف علوم وفنون کے جھرمٹ میں سرخروئی کا موقع عطا کیا۔ یہی لوگ تاریخ کی مراد اور لوح تاریخ پر کندہ سنہرے حروف ہیں جن کی روشنی آج بھی لوگوں کو اپنی منزل پر پہنچنے میں مدد دیتی ہے۔

تاریخ ایسے لوگوں کے تذکرے سے بھری پڑی ہے مگر ہماری بدقسمتی یہ ہے کہ ہم نے اپنے ان چراغوں کی روشنی سے مستفید ہونے اور اپنے باطنی ماحول کو روشن کرنے کی بجائے اندھیروں میں جھانکنے اور جگنو تلاش کرنے کی عادت اپنا لی جس کی وجہ سے ایک منور معاشرہ سایوں اور سرابوں کی نذر ہو گیا۔

عزیز محترم صاحبزادہ خورشید احمد گیلانی مرحوم کو اپنی مختصر زندگی میں شدت سے یہ احساس رہا کہ جب تک ہم خاک کوفہ و نجف کو اپنی آنکھ کا سرمہ بنانے اور دنیا کو بینائی عطا کرنے والی ان شخصیات کی سیرت اور کارناموں، جہاد زندگی اور اسلوب حیات کو مشعل راہ نہیں بنائیں گے سفر رائیگاں سے نجات حاصل نہیں کر سکتے جو ہم ایک عرصے سے کرتے چلے آ رہے ہیں اور جس کا نتیجہ پریشانی اور پشیمانی کے علاوہ نہیں نکل سکتا۔

صاحبزادہ خورشید احمد گیلانی ؒ نے اپنے خداداد اسلوب تحریر اور گداز انداز بیان

کے ذریعے ان شخصیات کی روشنی کا وہ رخ عوام کے سامنے پیش کرنے کی کوشش کی ہے جس پر بالعموم توجہ نہیں دی گئی۔ یہ وہ رخ ہے جو حیات سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم سے مستعار ہے جس میں محبت ہے، اخوت ہے، نرم خوئی اور رواداری ہے، احتساب ذات اور تزکیہ نفس ہے۔ تحمل و برداشت ہے۔ نیکی کی تلقین بھی اس انداز میں ہے کہ مخاطب کو سرتابی کی مجال نہ رہے اور مکروہات دنیا سے اجتناب کی ترغیب اس انداز میں دی جاتی ہے کہ گریز کے سوا راستہ نظر نہ آئے۔

''از دل خیزد بردل ریزد'' کے مصداق چونکہ عزیز محترم خود بھی زندگی بھر انہی صحابہ کبارؓ، اتقیاء امتؒ اور اکابرین ملت کی طرح نہ صرف ایسے اوصاف کی ترویج کے لئے کوشاں رہے بلکہ خود کو بھی دینا کے سامنے نمونہ بنا کر پیش کیا اس لئے ان کی تحریر میں اثر پذیری کا عنصر فراواں ہے اور انسان مطالعہ کے دوران اپنے آپ کو ایک خاص ماحول میں محسوس کرتا ہے۔ وہی ماحول جس میں یہ شخصیات اپنے شب و روز گزارتی تھیں، زمانے کے ساتھ چلنے اور اپنے آپ کو ہجوم کا حصہ بنانے کی بجائے اسے اپنی ڈھب پر چلانے کی تگ و دو کرتی تھیں اور وہ ماحول جس میں جینے کی خواہش صاحبزادہ خورشید گیلانی کو بے چین کئے رکھتی تھی۔

صرف 45 سال کی مختصر زندگی میں صاحبزادہ خورشید گیلانیؒ کی شخصیت، انداز خطابت اور اسلوب تحریر کو جو ہمہ گیر پذیرائی ملی اور جس طرح انہوں نے خلق خدا کی محبوبیت کا اعزاز حاصل کیا وہ اللہ تعالیٰ کے ہاں ان کی دینی خدمات اور علمی و قلمی مساعی کی مقبولیت کا مظہر ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں جو گداز دل اور دردمند دماغ عطا کیا تھا اس نے زندگی کے ایک ایک لمحے کو ایسے انداز میں بسر کرنے کی طرف مائل کیا جو ان بندگان خدا کا خاصہ تھا جس کا تذکرہ ''تاریخ کی مراد'' میں نظر آتا ہے۔

12 ربیع الاول 1422 (مطابق 5 جون 2001ء) کو ان کی وفات سے بھی خلق خدا نے یہی نتیجہ اخذ کیا کہ ذات رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم سے گہری وارفتگی اور سیرت

طیبہ کو عالم انسانیت سے روشناس کرانے کی تڑپ رنگ لائی اور موت نے اس وقت انہیں اپنی بانہوں میں لیا جب زمین و آسمان پر انس و ملک ولادت رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کی خوشیاں منا رہے تھے۔ اس عاشق رسولؐ اور مبلغ اسلام ادیب، خطیب، دانشور نے اس کتاب میں تاریخ کی مراد شخصیات کا تعارف اپنے منفرد انداز میں کرایا ہے۔ پڑھتے ہوئے آپ محسوس کریں گے کہ واقعی آپ ان سے پہلی بار متعارف ہو رہے ہیں۔

کتاب کی تدوین و اشاعت میں عزیز محترم عمران نقوی، سید سعد اللہ شاہ اور سید احسان گیلانی نے جو کد و کاوش کی اللہ تعالیٰ اس پر انہیں جزائے خیر عطا فرمائے۔

ارشاد احمد عارف

230۔سی۔مرغزار، ملتان روڈ، لاہور

ملنے کے پتے

☆ خزینۂ علم وادب' الکریم مارکیٹ اردو بازار لاہور۔

☆ ضیاء القرآن پبلی کیشنز' دربار روڈ' لاہور۔

☆ مکتبہ علم وعرفان' اردو بازار لاہور۔

☆ فرید بک سٹال' اردو بازار لاہور۔

☆ مکتبہ تعمیر انسانیت' اردو بازار لاہور۔

☆ سعد پبلی کیشنز' پہلی منزل میاں مارکیٹ' اردو بازار لاہور۔

☆ مکتبہ جمال کرم' 9 مرکز الاویس' دربار مارکیٹ اردو بازار' لاہور۔

امت کا پہلا ”صوفی“

سیدنا صدیق اکبرؓ کا تعارف ایک صوفی کا نہیں صحابی کا ہے، ایک راست رو اور راست گو انسان کا ہے، جو معاملات دنیا سے بخوبی آشنا اور زمانے کی الٹ پھیر سے آگاہ ہے، واقعات کو حقائق کی میزان میں تولنے اور نقد و نظر کی کسوٹی پر پرکھنے کا عادی ہے، جسے بات کی تہہ تک پہنچنے کا خصوصی ملکہ حاصل ہے آپ ایک دور اندیش مدبر، کامیاب حکمران، بااصول سیاستدان، معاملہ فہم، دیانتدار تاجر اور سنگین ترین بحرانوں میں اپنا ذہنی و عملی توازن برقرار رکھنے والے فرد کے طور پر جانے جاتے ہیں، جبکہ تصوف کا لفظ پڑھتے ہی ذہن خاص قسم کے مراقبوں، اعصاب شکن مجاہدوں اور پیچ در پیچ چلّوں کی طرف چلا جاتا ہے، تصوف کے بارے میں تاثر یہ ہے کہ یہ ترک دنیا ہے، چلہ کشی ہے، آزار نفس ہے، ایک طرح کا عالم مدہوشی ہے، حالت جذب و جنون ہے، خود اختیاری جلاوطنی ہے، خود مسلط کردہ تنہائی ہے اور اپنی ذات کی نفی ہے، اور اسی طرح صوفیاء کا نام آتے ہی ایسے لوگوں کی صورتیں پردۂ خیال پر ابھر آتی ہیں جو ہر وقت عالم سکر میں ہوں، ایسے لوگوں کے ہاتھوں محیّر العقول واقعات کا ظہور ہوتا ہے، جو پل بھر میں دنیا جہان کی خبریں لا دیتے ہیں، بغیر پروں کے اڑتے ہیں، سمندر میں مصلیٰ بچھا کر اسے کشتی بنا لیتے ہیں اور پار اتر جاتے ہیں۔

ہمارے نزدیک نہ تصوف کی یہ صحیح تشخیص ہے اور نہ صوفیاء کی درست تصویر! تصوف ترکِ دنیا کا نام نہیں، غرقِ دنیا ہونے سے بچنے کا اہتمام ہے، تصوف چلہ کشی

نہیں رسم عاشقی ہے، آزارِ نفس نہیں ضبط نفس ہے، عالم مد ہوشی نہیں رمز بے خودی ہے، جلاوطنی نہیں انا شکنی ہے، شوق تنہائی نہیں لذّت آشنائی ہے جو:

دو عالم سے کرتی ہے بیگانہ دل کو

اپنی ذات کی نفی نہیں ذات حق کے لیے خود سپردگی ہے، اور اسی طرح صوفی وہ نہیں جس سے محیّر العقول واقعات ظاہر ہوں بلکہ صوفی وہ ہے جس کے صحبت یافتہ اپنے نفس پر قادر ہوں، صوفی پل بھر میں دنیا جہان کی خبر نہیں دیتا تاہم خالق کون و مکان کو پہنچانے والی نظر عطا کرتا ہے، صوفی شعبدہ باز نہیں کردار ساز ہوتا ہے، وہ لوگوں کو ورطۂ حیرت میں نہیں ڈالتا، آشنائے حقیقت بناتا ہے، وہ لوگوں کے راز جاننے کے لیے سینے نہیں ٹٹولتا بلکہ دل کے دروازے کھولتا ہے، وہ ہواؤں میں نہیں اڑتا، نہاں خانۂ قلب میں اترتا ہے، وہ سمندروں میں نہیں تیرتا، چوروں کی تقدیریں پھیرتا ہے، وہ کرشمے نہیں دکھاتا زندگی گزارنے کے گُر سکھاتا ہے، وہ طلسماتی ڈھنگ نہیں اپناتا، کائناتی آہنگ رکھتا ہے، وہ محض فاقے نہیں کاٹتا صدیوں کی خلیج پاٹتا ہے، صوفی بیابانوں کا نہیں میدانوں کا آدمی ہوتا ہے وہ ''از دنیا گریز'' کا نہیں ''بازمانہ ستیز'' کا قائل ہوتا ہے، اگر ہم تصوف اور صوفی کے بارے میں اپنا نقطہ نظر درست کرلیں تو اس وقت سیّدنا صدیق اکبرؓ تصوف کی سب سے اونچی مسند پر ہمیں جلوہ افروز نظر آئیں گے۔

واقعہ یہ ہے کہ تصوف بے میل محبت کا نام ہے اور اس میں کیا شک ہے کہ کنول کا پھول اتنا شفاف نہیں ہوتا جتنا سیدنا ابوبکرؓ کا عشقِ رسولؐ شفاف ہے، فرض کیا تصوف کو عمر بھر کا چلہ مان لیا جائے تو بھی دنیا جہان کے تمام صوفیوں کے پہاڑوں کی کھوہوں میں کاٹے گئے چلّے ایک طرف مگر حضرت صدیق اکبرؓ کی غارِ ثور کی تین راتیں ان سب پر بھاری نظر آتی ہیں۔

حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ نے ''فتوح الغیب'' میں فرمایا ہے:

''تصوف آٹھ خصلتوں پر مبنی ہے سخاوت ابراہیم علیہ السلام، رضائے اسحاق علیہ

السلام، صبر ایوب علیہ السلام، مناجاتِ زکریا علیہ السلام، غربت یحییٰ علیہ السلام، خرقہ پوشی موسیٰ علیہ السلام، تجرد عیسیٰ علیہ السلام اور فقر محمد ﷺ۔

جہانِ تصوف کے نامور شیخ کی بیان کی گئی تصوف کی تعریف پڑھیئے اور اس آئینے میں سیدنا صدیق اکبرؓ کی تصویر دیکھیئے تو دل خود بخود پکار اٹھے گا کہ سب سے پہلا صوفی وہ ہے جسے سب سے پہلے صحابی بننے کا شرف حاصل ہوا ہے، سخاوت بھی اگر تصوف ہے تو حضرت ابو بکرؓ سے بڑھ کر سخی اور ان سے بڑا صوفی اور کون ہو سکتا ہے، کہ جس دور میں عرب کا معاشرہ مال لُوٹنے پر ناز کرتا تھا حضرت ابو بکرؓ نے اپنا مال اللہ کے نام پر لٹانے کا ریکارڈ قائم کیا اور حضورؐ نے فرمایا ''مجھے کسی کے مال نے اس قدر فائدہ نہیں پہنچایا جتنا کہ ابو بکرؓ کے مال نے۔''

مزاجِ یار کے سامنے سر تسلیم خم کرنے اور رضائے محبوب طلب کرنے کو حضرت شیخ نے تصوف کہا ہے تو تسلیم و رضا کو اگر ایک محسوس پیکر مان لیا جائے تو اس کا ٹھوس نمونہ حضرت ابو بکرؓ بنتے ہیں، سفر معراج سے واپسی پر ابو جہل نے حضرت ابو بکرؓ کو علی الصبح بتایا کہ تمھارا دوست کہہ رہا ہے کہ میں رات کے پچھلے مگر مختصر پہر میں آسمانوں سے ہو کر آیا ہوں بھلا یہ بھی کوئی ماننے والی بات ہے؟ آپ نے فرمایا: ''تمہیں کس نے بتایا ہے''؟ بولا ''خود تمھارے دوست نے!'' آپ نے جواب دیا: ''تم حضورؐ سے سن کر نہیں مانتے، میں تمھارے منہ سے سنی ہوئی بات پر ایمان لاتا ہوں۔ اگر سدرہ نشین پل بھر میں زمین کے فرش پر اتر سکتا ہے تو حجرہ نشین مختصر پہر میں فراز عرش پر بھی جا سکتا ہے'' خوئے تسلیم کی اس سے بڑھ کر کیا مثال ہو سکتی ہے؟ صبر تصوف کا خاصہ ہے، اور صبر کیا ہے؟ ایک جگہ جم جانا، اپنے موقف پر، دشمنوں کے مقابلے میں، مزاحمتوں کے جواب میں، مخالفتوں کے طوفان میں، عہد وفا پر، اپنے قول پر۔

حضرت ابو بکرؓ کو دیکھیے۔ اعلان نبوت کے پہلے روز جو عہد باندھا تھا، دنیا نے رکاوٹوں کے ہزار بند باندھے مگر سیدنا صدیق اکبرؓ نے منزل انقلاب پر جا کر کمر کھولی،

عہد نبوت کے تیئس سال اور دور خلافت کے ڈھائی سال کتنے کٹھن مرحلے آئے اور ہر مرحلہ حوصلہ شکن اور ہر لمحہ اعصاب توڑ، مگر یہ صبر صدیقیؓ ہے جس نے حالات کے جبر کے سامنے سپر نہیں ڈالی، خواہ دارارقم کی خلوت ہو یا صحن کعبہ کی اذّیت، شعب ابی طالب کے فاقے ہوں یا سفر طائف کے صدمے، مکے کی گلیوں کی مزاحمت ہو یا سوشل بائیکاٹ کی کلفت، بدر میں تعداد کی قلت ہو یا اُحد میں وقتی شکست، دور تبوک کی تنگی و عسرت ہو یا فتح مکہ کا جشن مسرت، کیا کیا ہنگامہ خیز مرحلے تھے وہ وہ حشر اٹھا کہ دل بیٹھ بیٹھ گیا مگر حضرت ابوبکرؓ کہتے رہ گئے:

دنیا نے اپنے آپ کو بدلا گھڑی گھڑی
اک اہل عشق ہیں کہ جہاں تھے وہیں رہے

مناجات کو تصوف میں خاص مقام حاصل ہے، مناجات ہے کیا؟ بندے کا احساسِ کمتری اور خدا کی ذات کے لیے اعتراف برتری! رب سے تخاطب کا ایسا انداز کہ انسان دعا میں ڈھل جائے، اسے مناجات کہتے ہیں، آپ دیکھئے مناجات کا اس سے زیادہ پر اثر انداز کیا ہوسکتا ہے کہ ثانی اسلام، ہم نشین غار، رفیق بدر اور جلیس قبر رسولؐ، اپنے رب کے حضور فریاد کناں ہے۔

''کاش میں پرندہ ہوتا ایک درخت سے دوسرے پر اڑتا، بیٹھتا اور قیامت کے حساب سے بچا رہتا، کاش میں سوکھی لکڑی ہوتا جسے لوگ جلا ڈالتے تا کہ قیامت میں جلنے سے بچ جاتا''

غربت دنیا کے لیے باعث ندامت ہے مگر اہل اللہ کے لیے سامان ہزار عزت! غربت کا معنی اجنبیت ہے، جسے کوئی نہ جانے نہ پہچانے، دنیا کے التفات سے محروم شخص کو اجنبی کہتے ہیں، وہ شخص خود کو بدنصیب سمجھتا ہے، جو''دنیا میں اجنبی بن کر رہ جائے، مگر صوفی اس پر فخر کرتا ہے کہ''دنیا اس کے لیے اجنبی ہو کر رہ جائے''

دنیا میں اجنبی ہونا اور دنیا سے اجنبی بننا دو مختلف کیفیات ہیں، ایک کیفیت دردِ سر

ہے اور دوسری سرمایۂ فقر ہے۔

لوگ جانیں مجھے محروم وقار و تمکیں
وہ نہ سمجھیں کہ میری بزم کے قابل نہ رہا

حضرت ابو بکرؓ باوقار خاندان کے معزز شہری تھے مگر اسلام کے لیے اجنبی کہلائے، یہ الگ بات ہے کہ رفیق نبیؐ کا اعزاز حاصل کر لیا، اگر اجنبیت کے بدلے میں ایسی رفاقت ملے تو یہ غربت نہیں سب سے بڑی امارت ہے، خرقہ پوشی موسیٰ علیہ السلام کو شاہ جیلانیؒ نے تصوف کی علامت کہا ہے، ہند اور سندھ کے صوفیوں نے بہت خرقے پہنے ہوں گے، اور خرقہ پہن کر بہت بڑے صوفی کہلائے ہوں گے مگر غزوہ تبوک کی تیاریوں کے دور میں جب سیدنا صدیق اکبرؓ نے گھر بھر کا سارا سامان حضورؐ کی نذر کر دیا اور ٹاٹ کے پیرہن میں کانٹوں کے تکمے لگا کر بارگاہ نبوت میں حاضر ہوئے تو یہی وہ خرقہ تھا جس کی دھوم فلک الافلاک پر پہنچی، اس روز جبریل امین علیہ السلام اس حال میں وحی لے کر آئے کہ ٹاٹ کا لباس زیب تن تھا حضور کو اس پر تعجب ہوا اور فرمایا ''یہ کیا؟'' حضرت جبریل علیہ السلام نے عرض کیا۔ ایک مجھ پر کیا موقوف ہے تمام فرشتے اسی لباس میں ملبوس ہیں کیونکہ آج ابو بکرؓ کا ٹاٹ کا خرقہ سلطنت سماوی کا سرکاری لباس قرار پایا ہے۔

تجرّد بھی تصوف کا خاص مقام ہے تجرّد کیا ہے؟ علیحدگی! کس سے؟ ماسوٰی اللہ سے! آرزوؤں سے! آلائشِ نفس سے! ہوس زر و مال سے! حُب جاہ و منصب سے! مفادات عاجلہ سے! حتیٰ کہ اللہ کے لیے وطن، مال اولاد اور جان سے علیحدگی! بلاشبہ حضرت ابو بکرؓ نے تجرّد میں کمال تفرّد حاصل کیا، اللہ و رسولؐ کے لیے وطن مالوف مکہ کو چھوڑا، ہجرت کی رات گھر بار کو چھوڑا، ہر آزمائش کے موقع پر اپنے مال و متاع سے ہاتھ کھینچا، غزوہ بدر میں اپنے بیٹے عبدالرحمٰن کا مقابلہ کیا، رہا جان کا معاملہ! تو اس بارے میں ان کا طرز عمل یہ رہا۔

یہ جان تو آنی جانی ہے
اس جان کی کوئی بات نہیں

فقر محمد تصوف کی جان ہے اور ابو بکرؓ جیسا مرد فقیر کسی نے نہیں دیکھا ہو گا، فقر نعرہ نہیں ایک روّیہ ہے، اسلوب اظہار نہیں خوبصورت شعار ہے، فقیر وہ نہیں جس کا دامن تہی ہو بلکہ وہ ہے جس کا دل غنی ہو، فقر یہ نہیں کہ دولت نہ ہو بلکہ فقر یہ ہے کہ دولت کی چاہت نہ ہو، فقر غربت کا نام نہیں ایک کیفیت کا نام ہے اور اس کا احساس صرف مرد فقیر کو ہوتا ہے، جب وہ دنیا سے غنی بن کر فرش خاک پر بیٹھتا ہے تو خود کو ہمسایہ جبریل علیہ السلام سمجھتا ہے، فاقے ہوں تو اس کی سانس گھٹتی نہیں زر و جواہر پاس ہوں تو دل کی دھڑکن بڑھتی نہیں، یہ لوگ شاہانِ بے تاج اور خسرواں بے کلاہ ہوتے ہیں، ان کی شان قلندری کے سامنے آن بان سکندری بے معنی ہوتی ہے ان کی فقیری میں کونین کی امیری کا رنگ جھلکتا ہے، فقر کی یہ شان اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ آپ کو اسوۂ صدیقیؓ میں نظر آئے گی۔

کہ آپ جانشین رسولؐ ہیں لیکن بیوہ کو بکری کا دودھ دوہنے میں مدد دیتے ہیں، دس لاکھ مربع میل کے حکمران ہیں لیکن ایک بوڑھی کے گھر کی روزانہ صفائی کرتے ہیں، امیر المومنین ہیں لیکن منصب امارت سنبھالنے کے ٹھیک دوسرے روز کندھے پر کپڑوں کے تھان رکھ کر بیچنے کو بازار نکل کھڑے ہوتے ہیں، خزانہ عامرہ دسترس میں ہے لیکن تنخواہ ایک مزدور کے برابر لیتے ہیں۔ ان کی حدود حکومت برابر بڑھتی جاتی ہیں مگر گھر کا اثاثہ روز بروز گھٹتا جاتا ہے، حکمران زندگی میں اپنے زر نگار مقبرے بنوا لیتے ہیں مگر ریاست اسلامی کا پہلا باقاعدہ امیر وصیت کر جاتا ہے کہ مجھے تن کے کپڑوں میں کفن دینا کفن کا نیا کپڑا کسی زندہ کے کام آ جائے گا اور میرا جنازہ روضہ رسولؐ پر لے جانا اذن ملے تو وہیں دفنا دینا نہیں تو شہر سے باہر پیوند خاک کر دینا یہی وہ فقر ہے جس کو

ذات رسالت مآبؐ نے اپنے لیے فخر قرار دیا ہے۔

اب تک جو کچھ کہا گیا ہے اگر تصوف یہی ہے اور یقیناً یہی ہے تو امت کے پہلے "صوفی" ہونے کی قبائے زیبا حضرت ابوبکرؓ کی قامت رعنا پر راست آئی ہے۔

☆☆☆☆

مُرادِ نبوت

تصوف کے مورث اعلیٰ حضرت حسن بصریؒ فرمایا کرتے تھے:۔

''اگر تم چاہتے ہو کہ تمھاری محفل پاکیزہ اور خوشگوار ہو جائے تو عمرؓ کی باتیں کیا کرو'' حضرت حسن بصریؒ کے ممدوح حضرت عمرؓ وہی ہیں جو صرف شیخ بصریؒ ہی کے نہیں پورے عالم کے ممدوح ہیں، جنہیں اہل اسلام دعائے رسولؐ کا ثمر کہتے ہیں، جو مراد نبوت کہلاتے ہیں اور جن کے فضائل بیان کرنے کو دفتر درکار ہیں۔

حضرت عمرؓ کو یہ شرف حاصل ہے کہ انہیں بارگاہ رسالت مآبؐ سے متعدد بار خراج محبت و تحسین پیش کیا گیا، ایک بار حضورؐ نے فرمایا:۔

''اللہ تعالیٰ (بعض اوقات) عمرؓ کی زبان سے بولتا ہے''

ایک اور موقع پر ارشاد فرمایا:

''شیطان عمرؓ کے سائے سے بھی دور بھاگتا ہے''

ایک اور حوالے سے حضورؐ نے یوں فرمایا:

''اگر میرے بعد کوئی نبی ہوتا تو وہ عمرؓ ہوتا لیکن میرے بعد کوئی نبی نہیں آئے گا''

حضرت عمرؓ کو پوری تاریخ اسلامی میں یہ منفرد اعزاز حاصل ہے کہ ہر ایک نے اپنی خواہش اور طلب پر حضورؐ سے مصاحبت اختیار کی لیکن حضرت عمرؓ کو اپنی صحبت اور رفاقت کے لیے حضورؐ نے اللہ تعالیٰ سے دعا کر کے منتخب فرمایا۔

اولین مکی دور میں جب حضورؐ پر اور صحابہ پر بے پناہ دباؤ تھا، صرف انتالیس افراد

حلقہ بگوش اسلام ہوئے تھے، کعبے میں نماز پڑھنے کی اجازت تک نہیں تھی، کوئی مسلمان اللہ کی عبادت کرتے نظر آجاتا تو اس پر قیامت ٹوٹ پڑتی، گلیاں اور بازار اہل اسلام کے لیے عقوبت خانے بن چکے تھے، اہل اسلام مغلوب اور اہل کفر غالب تھے، خود رسول اکرم ﷺ کو کئی بار تشدد کا نشانہ بننا پڑا، وہ مسلمان جو غلام تھے ان کے لیے تو شہر مکہ پھانسی گھاٹ بنا ہوا تھا، دار ارقم کا چھوٹا سا حصہ مسلمانوں کے لیے گوشہ عافیت تھا ورنہ قدم قدم پر قیامت سے سابقہ پیش آتا تھا، صحابہ کرامؓ گردن جھکا کر اور لوگوں سے چھپ چھپا اور نظریں بچا کر گھر سے باہر نکلتے تھے مگر ابوجہل اور عمر بن خطاب جیسے لوگ سر اٹھا اور گردنیں اکڑا کر کوچہ و بازار میں چلتے تھے، حضورؐ نے اپنے ساتھیوں کی بے بسی اور شہر والوں کی بے حسی دیکھ کر بارگاہ ایزدی میں عرض کیا۔

"خدایا! اسلام کو عمرو بن ہشام یا عمر بن خطاب کے ذریعے تقویت عطا فرما، ان دونوں میں سے جو بھی تجھے محبوب ہو اسے مشرف بہ اسلام فرما"

دعائے نبوت اس شان سے بارگاہ الٰہی میں پہنچی کہ اجابت نے جھک کر استقبال کیا اور حضرت عمرؓ حلقہ بگوش اسلام ہو گئے، اور یوں معلوم ہو گیا کہ اللہ تعالیٰ کا محبوب کون ہے؟ اور عمرو بن ہشام جسے معاشرے میں "ابوالحکم" (دانائیوں کا باپ) کہلوانے کا شوق تھا وہ تا قیامت "ابوجہل" کے خطاب کا سزاوار ٹھہرا اس لیے کہ وہ سب سے بڑی حکمت اور حقیقت سے بے بہرہ رہا، آپ مسلمان ہوئے تو مسلمانوں کی تعداد چالیس ہو گئی اس طرح آپ کو "متمم الاربعین" کا لقب ملا۔

آپؓ داخل اسلام کیا ہوئے کہ مصائب و آلام کی دھند چھٹنے لگ گئی، آپؓ سیدھے خانہ کعبہ پہنچے اور بڑی بلند آہنگی سے ساکنان شہر کو مخاطب فرمایا۔

"جو کوئی اپنی ماں کو ماتم گسار، اپنے بچوں کو یتیم اور بیوی کو بیوہ بنانا چاہتا ہے وہ آئے اور ہمیں اللہ کے گھر میں اللہ کی عبادت سے روکے"

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ فرماتے ہیں:

''حضرت عمرؓ کا اسلام ہماری کامیابی تھی، ان کی ہجرت ہماری نصرت اور انکی خلافت ہمارے لیے باعث رحمت تھی، جب تک عمرؓ اسلام نہیں لائے تھے، ہم کعبے میں نماز نہیں پڑھ سکتے تھے جب وہ اسلام لائے تو قریش سے لڑ بھڑ کر ہمارا حق تسلیم کرالیا کہ ہم بھی کعبے میں نماز پڑھ سکتے ہیں''

حضرت عمرؓ کے اسلام قبول کرنے کے ساتھ ہی مسلمانوں کے حالات بدلنے لگے، ان میں خود اعتمادی آگئی، وہ کھل کر دوسروں کو اسلام کی دعوت دینے لگے اور طلوع ہونے والی ہر صبح اشاعت اسلام کا پیغام ثابت ہوئی، اس موقع پر حضورؐ نے فرمایا:۔

''اللہ تعالیٰ نے عمرؓ کی زبان اور ان کے دل کو حق سے سرفراز فرمایا اور وہ ''فاروق'' ہیں جن کے ذریعے حق اور باطل کے درمیان تفریق کی گئی''

اس سے پہلے حضرت عمرؓ ان لوگوں میں شامل تھے جو پوری شدت سے اہل اسلام کی مخالفت کرتے اور انہیں ایذائیں پہنچاتے تھے اور اب یہی حضرت عمرؓ تھے جو پوری قوت سے اہل کفر کی مزاحمت اور اہل اسلام کی حمایت کرتے تھے، قوت و شدت وہی رہی لیکن فیض صحبت رسولؐ سے اس کا رخ بدل گیا، اسی لیے حضورؐ نے ارشاد فرمایا:۔

''خیارکم فیی الجاھلیتہ خیارکم فی السلام'' (جو لوگ جاہلیت میں بہتر تھے وہ اسلام میں بھی بہتر ثابت ہوئے)

گزشتہ سے پیوستہ عشرے میں مائیکل ہارٹ کی کتاب (The Hundred) کا بڑا چرچا رہا، جس میں اس نے تاریخ انسانی کی سو عظیم شخصیات کو موضوع بحث بنایا، مذہب، تاریخ، سیاست، سائنس، ادب اور تحقیق کے میدان میں جن شخصیات نے لازوال کارنامے سرانجام دیئے اور پوری تاریخ میں نمایاں نام اور بلند مقام حاصل کیا ان کا تذکرہ اس کتاب میں ملتا ہے، اربوں انسانوں میں صرف سو افراد کا انتخاب کتنا کٹھن اور مشکل ہے تاہم ان سو جلیل القدر اور ابدی شہرت کی حامل شخصیتوں میں اٹھاونواں نمبر حضرت عمرؓ کا ہے، مصنف اگرچہ یہودی ہے تاہم اس نے پہلے نمبر پر پوری

انسانیت کے محسن و آقا اور بالخصوص حضرت عمرؓ کے مربی و مولا رسول اکرمؐ کو جگہ دی ہے، ان شخصیات میں حضرت موسیٰ علیہ السلام، بدھ، مارکس، نیوٹن، سقراط، افلاطون، آئن سٹائن وغیرہ شامل ہیں۔

حضرت عمرؓ فی الواقع ان سو اشخاص میں شامل ہیں جنہوں نے تاریخ انسانی پر گہرے اثرات چھوڑے ہیں، اور عدل فاروقیؓ تو ایک ضرب المثل کی حیثیت اختیار کر چکا ہے۔

حضرت عمرؓ کو یہ اعزاز کسی خاندانی پس منظر، کسی مالی حیثیت اور کسی علمی وجاہت کی بنیاد پر نصیب نہیں ہوا، بلکہ اسلام کی نسبت اور پیغمبر اسلامؐ کی تربیت کے طفیل انہیں یہ مرتبہ ملا۔

حضرت عمرؓ قبول اسلام سے پہلے یا تو اپنے ماموں کے اونٹ چرایا کرتے تھے یا پھر عکاظ کے میلوں میں شہسواری اور پہلوانی کے جوہر دکھاتے تھے، تاہم قریش کی سفارت کا فریضہ بھی سر انجام دیتے تھے کیونکہ کچھ نہ کچھ پڑھنا لکھنا جانتے تھے، مگر اسلام کے دامن سے وابستہ ہونے کا نتیجہ یہ نکلا کہ تدبر اور تفقہ اور شعور و آگہی کی منزلیں اس تیزی سے طے کیں، کہ جب خلافت کا عہدہ سنبھالا اور پھر جس انداز سے حکومت کی تو معلوم ہوتا تھا کہ آپ پیدا ہی حکومت کرنے کے لیے کیے گئے ہیں ''اولیات عمرؓ'' سے ہر صاحب علم آگاہ ہے، آپؓ نے اسلامی ریاست کو جدید خطوط پر استوار کیا، عصری تقاضوں کے عین مطابق مجتہدانہ اقدامات کر کے مدینے کی ریاست کو ایرانی و رومی امپائر کے برابر لا کھڑا کیا بلکہ ایرانی و رومی سلطنتوں کا سارا رعب اور دبدبہ صحرائے عرب کی ریت کی طرح بکھیر کر رکھ دیا، آپؓ ہی کے عہد مسعود میں سن ہجری کا آغاز اور اجراء ہوا، مستقل فوج (Regular Army) کا قیام بھی آپؓ کا کارنامہ ہے۔

بہر کیف ان باتوں کے لیے تو مورخ اور سیرت نگار کا قلم درکار ہے جو اس موضوع کا حق ادا کر سکے حضرت عمرؓ کے عہد گرامی میں ہونے والی فتوحات ایک وسیع

موضوع ہے، اور اس پر اہل فکر وقلم نے بہت قیمتی مواد جمع کر دیا ہے۔

امیر المومنین جب ابولولو فیروز کے حملے کے نتیجے میں گھائل ہو گئے اور خود محسوس کیا کہ اب جانبر ہونے کی کوئی امید نہیں تو آپؓ نے فوراً اپنے بیٹے حضرت عبداللہؓ کو ام المومنین سیدہ عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے پاس اس درخواست اور آرزو کے ساتھ بھیجا کہ وہ اپنے حجرہ میں مجھے دفن ہونے کی اجازت بخشیں، سیدہؓ حضرت عمرؓ کو پیش آنے والے حادثے پر پہلے ہی دل گرفتہ اور آبدیدہ تھیں حضرت عبداللہؓ حاضر ہوئے تو سیدہؓ کی رقت میں اور اضافہ ہو گیا آپؓ نے فرمایا یہ جگہ اگرچہ میں نے اپنے لیے رکھی تھی تاہم میں عمرؓ کی آرزو کو اپنی خواہش پر ترجیح دیتی ہوں، اس طرح حضرت عمرؓ کو حضورؐ کے پہلو میں دفن ہونے کا وہ لافانی اعزاز بھی نصیب ہو گیا جس میں حضرت ابوبکرؓ کے علاوہ کوئی اور شریک نہیں یوں آپؓ کے اعزازات میں ایک اور اعزاز کا اضافہ ہو گیا۔

دنیا تو شہر نبیؐ کی ہوا کو ترستی ہے مگر حضرت عمرؓ کو تا قیامت حضورؐ کے دامن کی ہوا ملتی رہے گی، جنیدؒ و بایزیدؒ جس طرح اپنی سانس روک کر اور دل کی دھڑکن تھام کر حاضر ہوتے ہیں وہاں حضرت عمرؓ کو ابدی نیند سونے کی سعادت میسر آ گئی ہے، حضرت عمرؓ کو اس درود وسلام سے برابر کا حصہ مل رہا ہے جو فرشتے اور اہل اسلام حضورؐ کی خدمت میں حاضر ہو کر پیش کرتے ہیں، حضورؐ کی ذات اقدس کا تو ایک پل کا سایہ زندگی کی کڑی دھوپ کے سفر کے لیے کافی ہے حضرت عمرؓ کو تو قیامت تک اس سائے میں رہنے کا شرف حاصل ہے، ظاہر ہے حضورؐ نے انہیں اللہ سے مانگ کر لیا تھا تو حاصل دعا کو اپنے سے دور کیسے رکھتے اور گوارا فرما لیتے۔

☆☆☆☆

حضرت علیؓ شہر حکمت کے باب عظیم

اسلام کے بطل جلیل اور تاریخ کے نامور سپوت حضرت علیؓ کو قدرت نے اتنے امتیازات اور اعزازات سے نوازا ہے کہ ان میں سے کوئی ایک امتیاز اور اعزاز دنیا بھر کی ناموری اور آخرت کی سرخروئی کے لیے کافی ہے۔

علیؓ جنہیں برسہا برس تک آغوش محمدؐ کی خوشبو اور گرمی نصیب رہی جنہیں نو عمر لوگوں میں سب سے پہلے ایمان لانے کا شرف حاصل ہوا جن کی پیشانی پر عہد جاہلی میں بھی بت پرستی کا داغ نہیں لگا، جو خدا کے آخری نبیؐ کے چچازاد بھائی ہیں، آپؓ کے حبالہ عقد میں نبیؐ کی صاحبزادی آئیں جن کے احترام کو خود پیغمبر وقت کھڑے ہو جایا کرتے تھے۔ آپؓ ہی کو خیبر کا گرانڈیل قلعہ فتح کرنے کا اعزاز اور زبان رسالت سے ''حیدر کرار'' کا لقب حاصل ہے جن کے صاحبزادوں میں ایک امام حسنؓ ہیں جو اسلام اور امت کے وسیع تر مفاد اور اتحاد کے لیے مسند اقتدار سے دستبردار ہونے کا حوصلہ رکھنے والے ہیں اور دوسرے امام حسینؓ ہیں جو آبروئے اسلام کی حفاظت اور ملت اسلامیہ کی وحدت برقرار رکھنے کے لیے حکمران وقت کے مدمقابل آنے کا جذبہ رکھنے والے ہیں۔

علیؓ جنہیں ہجرت کی رات بستر نبوت پر سونے کی عزت نصیب ہوئی اور جان نبوت کا بدل بننے کی عظمت ملی، جو ہر اسلامی غزوے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دوش بدوش رہے جن کا شمار عشرہ مبشرہ اصحاب بدر، مجاہدین احد، شرکائے خندق، اور

خلفاء راشدین میں ہوتا ہے جن کو حضورؐ کا گھر داماد ہونے کی سعادت ملی وہ آپؓ ہی ہیں جن کے گھر کا دروازہ صحن مسجد میں کھلتا تھا جن کی صبحیں اور شامیں سایہ رسولؐ میں بسر ہوتی تھیں، جن کے روز و شب قرب رسولؐ میں گزرتے تھے۔

علیؓ جنہیں ایک سے زائد بار زبان پیغمبرؐ سے مومن اور جنتی ہونے کی بشارت ملی وہ آپؓ ہی ہیں جن کے بارے میں ارشاد نبوت ہے ''علیؓ تمھاری ہڈیوں کے گودے تک میں ایمان بھرا ہوا ہے''

آپؓ ہی کے بارے میں فرمان رسالتؐ ہے ''علیؓ حق کے ساتھ ہے اور حق علیؓ کے ساتھ ہے'' آپؓ ہی کے متعلق حضورؐ نے فرمایا ہے کہ ''میں علم کا شہر ہوں اور علیؓ اس کا دروازہ ہے'' ایک اور موقع پر سید عالمؐ نے فرمایا ''میں علیؓ سے ہوں اور علیؓ مجھ سے ہیں''

آپؓ کی محبت کو زبان نبوتؐ نے ایمان اور آپؓ کے ساتھ عداوت کو نفاق قرار دیا آپؓ ہی کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر سرور کائناتؐ نے فرمایا ''جس شخص کا میں دوست ہوں علیؓ اس کا دوست ہے'' یہ لازوال شرف بھی حضرت علیؓ کو حاصل ہے کہ حضورؐ نے انہیں دنیا اور آخرت میں اپنا بھائی قرار دیا۔ علیؓ جن کے منہ سے نکلے ہوئے ایک جملے نے دنیا والوں کو پیغمبرانہ سیاست کا مزاج سمجھا دیا کہ ''اگر دین میرے سامنے نہ ہوتا تو میں پورے عرب کا سب سے بڑا سیاستدان ہوتا'' جن کے پورے خاندان کے لیے شہادت باعث سعادت رہی، جن کو دنیا نے ہمیشہ مسجد کا نمازی اور میدان کا غازی دیکھا، جن کا ماتھا سجدے میں اور ہاتھ تلوار کے دستے پر رہتا تھا، جو عمر بھر جو کی روٹی کھا کر شکر خدا بجا لاتا اور رسول اکرمؐ کے ساتھ عہد وفا نبھاتا رہا، جس کا عہد و پیمان اپنے دین و ایمان کی طرح ہمیشہ پختہ رہا۔

المختصر یہ کہ ایک پورے کا پورا دفتر جناب علی کرم اللہ وجھہ کے فضائل و مناقب میں تیار کیا جا سکتا ہے، جس کی شخصیت کی پرورش و پرداخت آغوش نبیؐ میں ہوئی جو بدو

شعور سے دین اسلام کا پیروکار ہو، جس کی جوانی کے آئینے میں عکس رسولؐ جھلکتا ہو، جس کی سرگرمیوں کا دائرہ خوشنودی رب ہو، جس کی نگاہ عقابی، جس کا ذہن آفاقی، جس کی سوچ کائناتی اور جس کا کردار ملکوتی ہو وہ کیوں نہ تاریخ کے لیے باعث فخر اور اہل زمین کے لیے قابل رشک بنے؟!

یہ سب کچھ بجا مگر لاکھوں سلام اور کروڑوں درود اس ذات قدسی صفات پر جس کے بحر کرم نے ایسے موتیوں کو اپنی آغوش میں پالا اور انہیں ساحل پر اس شان سے اچھالا کہ ان کی آب و تاب سے ایک جہان جگمگا اٹھا، ایک علیؓ پر کیا موقوف دربار نبیؐ کا ہر موتی آبدار اور ہر گوہر تابدار ہے، حضرات صحابہؓ ایک ہی مکتب کے متعلم، ایک ہی استاد کے شاگرد ایک ہی مسجد کے نمازی، ایک ہی کماندار کے سپاہی، ایک ہی سپہ سالار کے لشکری، ایک ہی گلستان کے خوشہ چین، ایک ہی خوان رحمت کے؟ ایک ہی مجلس کے حلقہ نشین اور ایک ہی مربی کے زیر تربیت تھے، مگر ان کا رنگ دیکھیں تو دھنک کے رنگوں کا تنوع ان کے سامنے ماند پڑتا نظر آتا ہے، اسی مکتب سے ابوبکرؓ ''صدیق'' بن کر نکلے، اس مجلس سے عمرؓ ''فاروق اعظم'' ہوئے اسی محفل میں عثمانؓ ''کامل الحلم والحیاء'' بنے، اور اسی حلقے سے علیؓ ''باب العلم'' ہو کر اٹھے، وہ ایک ہی بارگاہ تھی جس کے ریزہ چینوں میں ابوعبیدہؓ جیسے لوگ ''امین الامت'' کے لقب سے سرفراز ہوئے، عبداللہ بن مسعودؓ؟ کی شان سے ممتاز ہوئے، عبداللہ بن عباسؓ کو ''ترجمان القرآن'' کا اعزاز اور خالد بن ولیدؓ ''سیف اللہ'' کے شاندار تمغے کے مستحق ٹھہرے، اسی ذات والا صفات کے قدموں میں بیٹھنے کا اعجاز تھا کہ معراج کی شب بلالؓ کے قدموں کی چاپ جنت میں سنائی دے رہی تھی، سلمانؓ کو ''منا اہل البیت'' کی نوید مل رہی تھی، صہیب رومیؓ کو مسجد نبویؐ میں امامت کے مصلے پر نماز پڑھانے کا لافانی اعزاز نصیب ہو رہا تھا، ایک غلام زادے اسامہ بن زیدؓ کو سالار لشکر کا منصب سونپا جا رہا تھا، ایک نابینا عبداللہ بن؟ کے لیے آیات قرآنی نازل ہو رہی تھیں، اور حضرت حمزہؓ کو سید الشہداء کے عظیم المرتبت

نام سے یاد کیا جا رہا تھا۔

رسالت کے اسی آفتاب عالم تاب کی ایک زور دار کرن حضرت علیؓ پر پڑی تو ان پر علم و حکمت کے جملہ رموز و نکات منکشف ہو گئے، جس علی المرتضیٰ کو دنیا کی کسی یونیورسٹی کی ڈگری نہیں ملی اس کے منہ سے نکلا ہوا ایک ایک لفظ دنیا بھر کی جامعات کے سرمایہ علمی پر بھاری ہے، جس کے سر پر کسی درسگاہ کی فراغت کی دستار فضیلت نہیں باندھی گئی زمانے بھر کے مدرسوں کے صدر المدرسین اس کے سامنے ہاتھ باندھے کھڑے نظر آتے ہیں، یہ سب کچھ مکتب کی کرامت نہیں فیضان نظر کا معجزہ ہے۔

نبی امیؐ کی بخشی ہوئی علم و حکمت کی خیرات کا ہلکا سا رنگ ہی ''نہج البلاغہ'' میں نظر آتا ہے جو حضرت علیؓ کے چند مکتوبات، مکالمات اور ارشادات کا مجموعہ ہے، جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ نہج البلاغہ کو پڑھ کر قرآن مجید کے کلام الٰہی ہونے اور اس کے اعجاز کا انسان قائل ہو جاتا ہے، کہ ایک بندے کے زور کلام کا یہ عالم ہے تو خالق کائنات کے کلام کی معجز نمائی کا کیا رنگ ہوگا؟

نہج البلاغہ کے چوتھے حصے میں حضرت علیؓ کے مختصر ارشادات، بعض سوالوں کے جوابات اور انتہائی حکمت آمیز جملے درج ہیں، جو نہ صرف حکمت و دانائی کا صحیفہ ہیں بلکہ ادب و انشاء کا بھی شاہکار ہیں، جملوں کی بندش، تناسب، ایجاز اور اسلوب صاف پتہ دیتا ہے کہ بات کہنے والا ضرور مکتب نبوت کا طالب علم رہا ہے اس گل صد برگ کی چند پتیاں حاضر ہیں تا کہ مشام جاں کو معطر کیا جا سکے۔

حضرت علیؓ نے ایک موقع پر فرمایا:

''جب دنیا کسی پر مہربان ہوتی ہے تو دوسروں کی خوبیاں بھی اسے مستعار دیتی ہے اور جب پیٹھ پھیر لے تو اس کی اپنی خوبیاں بھی چھین لیتی ہے''

ایک اور جگہ ارشاد ہوتا ہے:

''اگر تمھیں اپنے مخالف پر غلبہ و قدرت حاصل ہو جائے تو عفو سے کام لو کہ یہی

غلبے کی نعمت کے لیے اظہار تشکر ہے''

اور ایک مقام پر ملاحظہ ہو:

''سب سے نادار شخص وہ ہے جو کسی کو دوست نہ بنا سکے، اور اس سے بھی زیادہ تہی دست وہ ہے جو دوستوں کو پا کر انہیں کھو دے''

ارشاد ہے:

''جسے اپنے رد کر دیتے ہیں اسے غیر اپنا لیتے ہیں''

فرماتے ہیں:

''جس کو اس کا اچھا عمل آگے نہیں بڑھا سکا اسے نسب کوئی عزت نہیں دے سکے گا''

یہ رنگ بھی دیکھنے کے قابل ہے:

''اے اولاد آدم! جب تو دیکھے کہ اللہ تعالیٰ تم پر پے در پے نعمتیں نازل کر رہا ہے اور تو اس کی نافرمانی پر کمر بستہ ہے تو اس لمحے سے خوف کھاؤ'' (کہ کہیں یہ آزمائش کا انداز نہ ہو)

حقیقت زہد کے بارے میں فرماتے ہیں:

''زہد کا افضل مرتبہ اپنے زہد کو چھپانا ہے''

خودی اور خودداری کا راز یوں کھولتے ہیں:

''اصل تمنا آرزوؤں کا ترک کر دینے کا نام ہے''

نیز

''جس کی امیدیں بڑھتی جائیں اس کے اعمال بگڑتے جاتے ہیں''

اپنے نور چشم حضرت حسنؓ کو وصیت کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

''مجھ سے چار باتیں سیکھ لو، سب سے بڑی تونگری عقل ہے اور غربت حماقت ہے، ناپسندیدہ ترین چیز تکبر ہے اور سب سے اچھا طریقہ حسن خلق ہے، میرے بیٹے،

احمق کی صحبت سے پرہیز کرو، وہ اپنے طور پر تمھیں نفع پہنچانے کی کوشش کرے گا مگر نتیجے میں تمھارا نقصان کر بیٹھے گا۔

بخیل کی دوستی سے بچو وہ تمہیں تمھاری ضروریات زندگی سے بھی محروم کر دے گا۔ فاسق و فاجر کی رفاقت سے گریز کرو کہ وہ تمھیں سستے داموں بیچ دے گا، اور جھوٹے کو دوست نہ بناؤ کہ وہ سراب کی مانند دور کی چیز قریب اور نزدیک والی شے دور کر کے دکھائے گا۔

حضرت علیؓ فرماتے ہیں:

''فرائض کو ضائع کر کے نوافل کے ذریعے قرب خدا حاصل نہیں ہوسکتا''

پندار نفس پر یوں ضرب لگاتے ہیں:

''وہ گناہ جو تمہیں افسردہ کر دے اس نیکی سے بہتر ہے جو مغرور بنا دے''

ایک اور حقیقت کا اظہار یوں فرماتے ہیں:

''اس وقت سے پناہ مانگو کہ جب شریف انسان بھوکا ہو اور کمینہ صاحب دولت بن جائے، دل کا احوال یوں سناتے ہیں۔ دل ایک اجنبی پرندہ ہے وہ صرف محبت کی شاخ پر بیٹھتا ہے''

رسم دنیا بیان فرماتے ہیں:

''تمھارے عیب اس وقت تک ڈھکے رہیں گے جب تک دنیا تم پر مہربان ہے''

حقیقت صبر کا اظہار ملاحظہ فرمائیں:

''صبر دو طرح کا ہوتا ہے، ایک ناپسندیدہ بات پر صبر اور دوسرے مرغوب چیز پر صبر یعنی ضبط کرنا''

یگانگی و بیگانگی کو یوں واضح فرماتے ہیں:

''آدمی مالدار ہو تو ہر دیس میں اپنا لگتا ہے اور نادار ہو تو اپنے وطن میں بھی اجنبی بن کر رہ جاتا ہے''

خیر خواہی کا اصل مفہوم ادا کرتے ہوئے فرمایا:

''جو شخص تمہیں نتائج بد سے ڈرانے والا ہے دراصل وہی تمھارا خیر خواہ ہے''

کم ظرف سے معاملہ آن پڑے تو کیا کرنا چاہیے جناب علیؓ فرماتے ہیں:

''ضرورت کا پورا نہ کرنا اس سے بدرجہا بہتر ہے کہ کسی کم ظرف سے کچھ طلب کیا جائے''

یہ انداز بھی لائق توجہ ہے:

''تھوڑا دینے سے کیا شرمانا بہرحال نہ دینے سے تو بہتر ہے''

حقیقی صاحب علم کون ہے؟ آپؓ نے فرمایا:

''اصل عالم اور فقیہہ وہ ہے جو لوگوں کو اللہ کی رحمت سے مایوس اور اس کی عنائت سے محروم نہ کرے اور اللہ کی خفیہ تدبیروں سے بے پروانہ ہونے دے''

حضرت علیؓ کا یہ فرمان بھی آب زر سے لکھنے کے قابل ہے:

''دو طرح کے عمل کا معاملہ بھی عجیب ہے کہ ایک عمل وہ جس کی لذت تو جاتی رہتی ہے مگر پھٹکار باقی رہتی ہے اور دوسرے وہ جس کی زحمت تو آخر ختم ہو جاتی ہے لیکن اجر محفوظ رہ جاتا ہے''

خداوند عالم کی کبریائی کی شان اس طرح واضح فرماتے ہیں:

''(حق تو یہ ہے کہ) اللہ کی عظمت تمھاری نظر میں بڑے سے بڑے آدمی کو چھوٹا بنا دے''

حریصانہ نفسیات کے متعلق فرماتے ہیں:

''طمع مستقل غلامی ہے''

اپنے عقیدے کی پختگی کے بارے میں یوں گویا ہیں:

''جب سے میں نے حق کو پایا ہے اس کے بارے میں کبھی شک کا شکار نہیں ہوا''

ایک اور عقدہ کشا فرمان۔

''ظالم کے لیے وہ لمحے بہت شدید ہوتے ہیں جب مظلوم کو اس پر فوقیت حاصل ہو جائے''

معرفت الٰہی کا راز یوں کھولتے ہیں:

''میں نے اللہ کی معرفت تب حاصل کی جب میرے ارادے فسخ ہو کر رہ گئے (اور غیر متوقع طور پر) مشکلات کی گرہیں کھلنے لگیں''

ایک شخص نے آپؓ سے سوال کیا،

''اللہ تعالیٰ اتنی بڑی مخلوق کا حساب کیسے لے سکے گا؟ آپؓ نے فرمایا جس طرح وہ انہیں رزق دے رہا ہے، اس نے پھر پوچھا، بھلا وہ کیسے حساب لے گا جب کہ لوگ اسے نہیں دیکھتے، آپؓ نے فرمایا جیسے وہ رزق عطا فرما رہا ہے، جب کہ لوگ اسے نہیں دیکھ پاتے''

حصول علم کے آداب یوں سکھاتے ہیں:

''تم سمجھنے کے لیے سوال و جواب کیا کرو اور الجھنے کے لیے نہیں''

حضرت علیؓ کا یہ حکیمانہ قول پڑھیئے اور حرز جاں بنالیجئے۔

''اللہ کی نافرمانیوں سے بچو کہ وہی گواہ بھی ہے اور (کل کو) حاکم بھی وہی ہوگا''

فلسفہ گناہ کا بیان انتہائی سہل زبان میں!

''سب سے سنگین گناہ وہی ہے جسے کرنے والا معمولی سمجھ کر کرے''

آپؓ سے پوچھا گیا کہ ''اگر کسی شخص پر تمام دروازے بند کر دئے جائیں تو اس کا رزق کہاں سے آئے گا؟''

آپؓ نے جواباً فرمایا:

''جہاں سے موت کا فرشتہ آئے گا''

اقوال علیؓ کا ایک اور آہنگ۔

''جو شخص اپنی ضرورت کسی صاحب ایمان سے بیان کرے تو گویا وہ اللہ کے

سامنے بیان کر رہا ہو اور اگر وہ کسی کافر کے در پر دستک دے تو سمجھ لے وہ اللہ کی شکایت اس کے پاس لے گیا ہے"

یہ لہجہ بھی باب العلم کے لیے خاص ہے۔

"قیامت کے دن سب سے زیادہ حسرت اس شخص کو ہو گی کہ جس نے ناجائز طریقوں سے مال کمایا اور اس کا وارث ایسا شخص بنا جس نے وہ سارا مال راہ خدا میں خرچ کر دیا، اب مال کمانے ولا جہنم رسید ہو گا اور خرچ کرنے والا جنت کا حقدار ٹھہرے گا"

آپؓ ارشاد فرماتے ہیں:

"دو بھوکے کبھی سیر نہیں ہوتے ایک طالب علم اور دوسرا طالب دنیا"

حضرت علیؓ نے ایک ان پڑھ بوڑھے سے فرمایا تم پڑھنا لکھنا کیوں نہیں سیکھ لیتے، اس نے کہا کیا حضرت! اس عمر میں پڑھتے ہوئے شرم آتی ہے، آپؓ نے فرمایا اس بڑھاپے میں جہالت سے عار نہیں تو پڑھنے میں عار کیسی"

یہ رہیں گلشن علم علیؓ کی چند کلیاں جن کی مہک سے وادی قلب و روح مہک اٹھی ہے، نہ جانے نگاہ نبوت میں کیا باغ کھلے ہوئے تھے کہ جس طرف وہ آنکھ اٹھی دل کے غنچے کھل اٹھے،

حضورؐ نے فرمایا تھا کہ "میں علم و حکمت کا شہر ہوں اور علیؓ اس کا دروازہ ہے" اس فرمان کی صداقت میں کیا شبہ ہے کہ فی الواقع صدیوں نے اس دروازے کی دریوزہ گری کی ہے۔ اور ابھی کئی زمانے قطار بنائے کھڑے ہوئے ہیں، اور اس انتظار میں ہیں کہ کب موقع ملے اور وہ علم کی اس چوکھٹ پر اپنا سلام نیاز پیش کر سکیں۔

☆☆☆☆

امام حسینؓ ۔۔۔ ایک منفرد شخصیت

دنیا میں کسی شخص کے لیے عزت و احترام کے نقطہ نظر سے یہ حوالہ بہت اہمیت رکھتا ہے کہ وہ کسی نامور روحانی اور دینی خانوادے کا فرد ہو، کسی اونچے معاشرتی خاندان کا سپوت ہو، کسی مسلمہ علمی شخصیت کا عزیز ہو، کسی بڑے سیاسی گھرانے کا نورِ چشم ہو اور کسی ممتاز اور مشہور ادیب اور خطیب کا جگر گوشہ ہو، اس طرح کی کوئی بھی نسبت اس شخص کے لیے عزت و وقار کی دائمی سند کا درجہ رکھتی ہے، دنیا بھر میں اس طرح کا کوئی بھی حوالہ لائق توجہ سمجھا جاتا ہے۔ کم از کم ایک دو نسلیں تو اس احساس سے معمور رہتی ہیں اور کوئی بھی انہیں اس اعزاز و استحقاق سے محروم نہیں کر سکتا۔

بایں ہمہ اگر وہ شخص ان حوالوں کے ساتھ ساتھ اگر خود بھی کوئی روحانی، سیاسی، معاشرتی، علمی اور ادبی حیثیت کا حامل ہو تو یہ سونے پر سہاگے والی بات ہے، اور اس کو ’’قران السعدین‘‘ بھی کہا جاتا ہے۔

اس پس منظر میں جب ہم حضرت امام حسینؓ کی تاریخی بلکہ صحیح تر لفظوں میں تاریخ ساز شخصیت کا جائزہ لیتے ہیں، تو ایک خوشگوار حیرت ہوتی ہے کہ امام حسینؓ اپنی دیگر خصوصیات کی طرح اس خصوصیت میں بھی انفرادی شان کے حامل نظر آتے ہیں۔

کوئی شخص اندازہ کر سکتا ہے کہ کیا کیا نسبتیں اور کیسی کیسی عظمتیں حضرت امام حسینؓ کے حصے میں آئیں، وہ کس کے نواسے، کس کے نورِ نظر، کس کے لختِ جگر اور کس کے بھائی ہیں؟ ایک ایک نسبت کی بزرگی اور رفعت کو دیکھنے کے لیے کوہ ہمالیہ جیسا قد

کاٹھ چاہیے، اس کے بعد بھی ٹوپی گرنے کا احتمال بلکہ یقین ہے۔

امام حسینؓ کو سید عالم پیغمبر آخر و اعظم کا نواسہ ہونے کا لازوال شرف حاصل ہے۔

حسینؓ کا نانا ﷺ وہ جس کے نام سے نبض ہستی تپش آمادہ اور خیمہ افلاک ایستادہ ہے، جس کی نسبت معراج انسانیت ہے، جس کی ذات سے اعتبار کائنات ہے، جس کا وجود برہان الٰہی ہے، جس کی ہستی آئیہ ربانی ہے، جس کا قول حدیث اور جس کا عمل سُنّت ہے، جس کی خلوت خود آگاہی اور جلوت خدا آگاہی کا مرقع تھی، جس کی بشریت آبروئے آدمیت اور جس کی نبوت رہبر انسانیت ہے، جس کے نور سے شبستان عالم چمک اور جس کے رنگ و بو سے چمنستان دہر مہک رہا ہے، جس کی خاک راہ سرمہ چشم بصیرت اور جس کا نقش کف پا جادہ طریقت و معرفت ہے، جس کا خیال الہام اور جس کا نطق وحی ہے، وہی سید عالمؐ، حسینؓ کے نانا ہیں، جن کے قدموں کی آہٹ سن کر کوئی خضر بنا اور جن کے در کی بھیک پا کر کوئی سکندر کہلایا۔

حسینؓ کا بابا کون؟ علیؓ جس کی پیشانی سجدہ غیر اللہ سے کبھی آلودہ نہیں ہوئی، جس کی ایک ایک سانس میں خوشبوئے نبیؐ بسی رہی، جس کو "باب العلم" کا لافانی خطاب حاصل ہے، جو ہر میدان جنگ میں "حیدر کرار" کہلایا، جس کی سیاست پر عبادت کا رنگ غالب رہا، جس کی روحانیت ہر سلسلہ تصوف کا سرچشمہ ٹھہری، جس کو کعبے میں ولادت اور مسجد میں شہادت نصیب ہوئی۔

حسینؓ نے کس کی آغوش میں جنم لیا؟ خاتون جنتؓ کی آغوش میں! جس کی آغوش کا تقدّس عرش کے تقدّس سے کسی صورت کم نہیں، جس کی چادر کا گوشہ سایہ جنت ہے، جس کے گھر کی چار دیواری کا جبریل علیہ السلام نے کئی بار طواف کیا، جس کے وجود کو زبان نبوت نے "گوشہ دل" اور "لخت جگر" کہا، جس کی عفت دلیل عصمت ہے، جس کو قرآن نے چادر تطہیر اوڑھائی، جس کا نام لینے کے لیے زبان کو کئی بار مشک و گلاب سے وضو کرنا پڑتا ہے، جس کی ناخوشی کا کبھی رسولؐ بھی متحمل نہیں رہا، جس کے گھر میں

احتراماً سورج کی شعاع نے کبھی جھانک کر نہیں دیکھا، حسینؓ بھائی کس کے ہیں؟ اس پانچویں خلیفہ راشد کے بھائی ہیں، جنہوں نے اپنی حکومت پر وحدت امت کو ترجیح دی، جس کے ایثار نے ملت کا وقار بڑھایا، جس کی طبع صلح پسند نے قوم رسول ہاشمیؐ کو شیرازہ بند رکھا، ورنہ خلافت بھی دو حصوں میں تقسیم ہو جاتی، اور امت قیامت تک کے لیے احیائے خلافت کا خوبصورت خواب دیکھنے سے بھی محروم ہو جاتی۔

امام حسینؓ کا اصل کمال اور انفرادیت یہ ہے کہ وہ اتنی عظیم نسبتوں اور شاندار حوالوں سے جڑے ہوئے ہیں لیکن اس طرح کے حوالے جہاں کسی کو بہت اونچا مقام دیتے ہیں وہاں اس کا نام گم ہو جانے کا مسئلہ بھی پیدا کر دیتے ہیں۔ امام حسینؓ ان حوالوں سے ایک مقدس اور محترم پہچان کے حامل تو ہیں ہی، اس کے ساتھ ساتھ تاریخ میں ان کا اپنا ایک مستقل مقام اور معزز نام بھی موجود ہے۔

عظمت وحرمت کی کہکشاں میں ممکن ہوتا ہے کہ ایک آدھ ستارہ دب جائے اور رنگ ونکہت سے معمور گلستان میں اندیشہ ہوتا ہے کہ کچھ پھول اپنی بہار نہ دکھلا سکیں، مگر اس کہکشاں میں ہر ستارہ روشن اور اس گلزار میں ہر پھول پُر بہار نظر آتا ہے۔

بڑے باپ کا بیٹا ہونا، عظیم ماں کا فرزند ہونا، جلیل القدر خانوادے کا فرد ہونا، پُر شکوہ گھرانے کا چشم و چراغ ہونا باعث سعادت تو ہے ہی مگر کسی امتحان اور آزمائش سے بھی کم نہیں ہوتا وہ یوں کہ بڑے باپ کی عظمت کی لاج رکھنا، عظیم ماں کی آغوش کا حق ادا کرنا، خاندان کی قدر و جلالت کا پاس ولحاظ اور گھرانے کی شان وشوکت کا تحفظ کرنا کوئی معمولی آزمائش نہیں، اور ساتھ ہی الگ سے اپنی شناخت بنانا کارے دارد!

امام حسینؓ کو تو یہ خراج محبت وعقیدت تا حشر ملتا رہے گا کہ وہ خانوادۂ رسالت کے چشم و چراغ ہیں مگر خاندان نبوت بھی اس پر ہمیشہ فخر کرتا رہے گا کہ حسینؓ اس کا ایک فرد ہے، جس کے نام سے تحریک اٹھی اور جس کی ذات سے ایک نئی تاریخ مرتب ہوئی، پیغمبرؐ کے لبوں نے کئی بار حسینؓ کی پیشانی پر بوسہ دیا اور حسینؓ نے یہی ماتھا خاک

وخون میں غلطاں ہونے دیا مگر خود باطل کی چوکھٹ پر سجدہ کناں نہیں ہوئے۔

جناب علیؓ نے اپنے لختِ جگر کو ہزار بار اپنے سینے سے چمٹایا اور فرزند عزیز نے بھی میدان میں پیٹھ نہیں دکھائی اپنے سینے پر تیر کھایا، سیدہ فاطمہؓ نے امام حسینؓ کو اپنی آغوش میں پالا۔ حسینؓ نے اپنے گود پالے دین حق کے لیے وادی نینوا میں قربان کر ڈالے، امام حسنؓ اور امام حسینؓ دونوں بھائی دوش نبیؐ پر کھیلے اور جب موقع آیا تو دونوں ناموس دین نبیؐ کی خاطر جان پر کھیل گئے، بنی نوع انسان رہتی دنیا تک حضورؐ کو محسن انسانیت، جناب علیؓ کو برہان فتح ونصرت، سیدہ فاطمہؓ کو پیکر عفت، حضرت حسنؓ کو اتحاد امت کی علامت اور سیدنا حسینؓ کو امام عزیمت کے طور پر یاد رکھے گی۔

امام حسینؓ نے یزید کے مقابلے میں استقامت دکھا کر اور میدان کربلا میں داد شجاعت دے کر نہ صرف اپنے عہد میں غرور ملوکیت توڑا، بلکہ پوری تاریخ کا رخ موڑ دیا۔ سانحۂ کربلا کے بعد اگرچہ موروثی حکومتیں قائم رہیں، لیکن کسی بھی دور میں نہ انہیں جواز مل سکا اور نہ تقدس نصیب ہو سکا، بڑے بڑوں نے زور لگایا کہ انہیں دل سے "امیر المومنین" تسلیم کرلیا جائے مگر سب دل کی دل میں رہ گئیں، کسی دوسرے کے دل میں نہ اتر سکے، انہوں نے اپنے نام کے خطبے پڑھوا لیے، خود کو "ظل الٰہ" کہلوایا، سکوں پر اپنا نام کندہ کروالیا، "امیر المومنین" کی مہریں بنوالیں، منبر ومحراب پر قبضہ جمالیا، مگر کسی کے دل و دماغ میں اپنا وقار و اعتبار قائم نہ کر سکے، 60ھ کے بعد دنیا بھر میں بالعموم اور عالم اسلام میں بالخصوص تحریکوں کا لاوا پھوٹ پڑا، اور آج تک یہ آتش فشاں زوروں پر ہے، کہیں نفس ذکیہ نظر آتے ہیں، کہیں امام مالکؒ جعفر کو للکارتے ہیں، کبھی امام اعظمؒ منصور کو لتاڑتے ہیں، کبھی احمد بن حنبلؒ معتصم کو مشکل میں ڈالتے ہیں، ان سب قالبوں میں روح حسینؓ رواں دواں تھی۔

کسی دور میں ملوکیت کے خلاف تحریک چلی، کسی عہد میں بنیادی حقوق کے لیے لہر اٹھی، کبھی معاشی انصاف کا نعرہ بلند ہوا اور کبھی حق خود ارادیت کا شور برپا ہوا۔

یہ ملوکیت کے خلاف نفرت کا جذبہ شہادت حسینؓ کا ثمرہ ہے، یہ بنیادی حقوق کا شہرہ خون حسینؓ کا معجزہ ہے، یہ معاشی انصاف کا نعرہ تحریک حسنیؓ کا صدقہ ہے اور یہ حق خودارادیت کا چرچا قافلہ سالار کربلاؓ کا کرشمہ ہے۔

جس طرح پھول کی تروتازگی، طراوت اور شادابی اس بات کی دلیل ہوتی ہے کہ اس کے باریک ریشوں میں پانی کی نمی کارفرما ہے یہ نمی نہ رہے تو پھول مرجھا جاتا ہے اسی طرح دنیا میں جاری جہادی تحریکیں اس امر کا پتہ دیتی ہیں کہ ان کی رگوں میں روح حسینؓ کارفرما ہے جبھی تو یہ تحریکیں زندہ ہیں بلکہ نشو ونما پا رہی ہیں، ان تحریکوں نے اگر روح حسینؓ سے اپنا ناتا توڑا، اور کسب فیض کرنا چھوڑا تو پھر یہ تحریکیں سوکھے ہوئے پھول کی طرح صرف کتابوں میں نظر آئیں گی۔ نہ ان میں تازگی رہے گی اور نہ توانائی، نہ زندگی رہے گی اور نہ شادابی، جس طرح پھول کی شگفتگی پانی کے قطرے کی محتاج ہے اسی طرح ہر اسلامی انقلابی تحریک امام حسینؓ کے جذبے کی محتاج ہے۔

یہ بات سمجھ لینے کے بعد اندازہ ہوتا ہے کہ امام حسینؓ عظمتوں کے ہجوم میں گھرے ہوئے ہونے کے باوجود تاریخ میں اپنا منفرد اور بلند مقام حاصل کرنے میں کیوں کر کامیاب ہوئے؟

☆☆☆☆

آزادی وانقلاب کے امام

یوں تو تاریخ کے پردے پر بے شمار شخصیتیں ابھریں اور ایک وقت میں تو اپنی شخصیت کی گھن گرج سے انہوں نے پوری دنیا کو لرزہ براندام کر دیا، بعض وہ تھیں جو مسند علم کی وارث ٹھہریں، کچھ طبیعات اور سائنس کی امام بنیں، ایسی بھی جو اخلاق و تصوف کے حوالے سے دنیا کی مرشد قرار پائیں، لیکن ان میں سے بہت سی تاریخ کے دھارے کے ساتھ بہہ گئیں۔ کچھ کو زمانے کی کروٹیں نگل گئیں۔ بعض حوادث روزگار کی نذر ہو گئیں۔ کئی ایک عالمی تبدیلیوں کی ہوا میں تحلیل ہو گئیں، چند نصابی کتابوں کی زینت بنیں اور اکثر یاد ماضی کا حوالہ داستان پارینہ اور دلچسپ قصہ بن گئیں، اگرچہ ایک بڑی تعداد ایسے رجال کار کی ہے جنہوں نے تاریخ، سمت، وقت، سوچ، ذہن اور جذبات کو پوری طرح اپنے قبضے میں لے کر خود کو مقام امر پر فائز کر لیا انہیں میں ایک روشن نام جناب حسینؓ کا ہے، چودہ صدیاں بیت چلیں مگر آپ کا نمایاں نام اور تاریخی کام بجائے گہنانے کے اور نکھرتا چلا جا رہا ہے اور وقت کی رفتار بتاتی ہے کہ مستقبل میں مزید نکھرے گا۔

انسان کو بیدار تو ہو لینے دو!!
ہر قوم پکارے گی ہمارے ہیں حسینؓ

جناب حسینؓ اب ایک فرد بشر، ایک آدم زاد، ایک خاندان کے روشن چراغ، ایک دور کی بہتر شخصیت ہی نہیں رہے بلکہ گردش زمانہ اب انہیں اس مقام پر لے آئی ہے کہ

ان کا نام جذبہ حریت اور ان کی شخصیت بذات خود تحریک اور انقلاب بن گئی ہے، ریگ گرم پر بہنے والے ان کے خون کے چھینٹے کاروان شوق کے لیے نقوش منزل قرار پائے ہیں اور ان کا مقتل سجدہ گاہ عاشقاں کا مرتبہ اختیار کر گیا ہے اور ان کی باتیں فلسفہ انقلاب کا درجہ پا چکی ہیں، ہمارے ہاں کے روایت پرستانہ مزاج اور شعبدہ پسند رجحان نے ان تاریخی شخصیتوں کو محض گرمئی تقریر، فن خطابت، مجادلہ و مناظرہ اور فرقہ وارانہ حجتوں کی نذر کر دیا ہے، ورنہ ہماری تاریخ جہد و عمل، علم و فضل، عظیم شخصیتوں، نامور ہستیوں اور نادرِ روزگار افراد کے اعتبار سے جتنی مالدار، روشن، نامدار اور وقیع ہے، اتنی کسی اور مذہب فلسفہ اور تہذیب کی تاریخ قابل رشک نہیں۔

ذرا ایک نظر ڈالیے حکمرانوں میں خلفاء راشدین، مجاہدہ و فقر میں خانوادۂ اہل بیت، ایثار و وفا میں حضرات صحابہؓ، تفقہ و تدبر میں ائمہ اربعہؒ روایت میں محدثین، فلسفہ و حکمت میں امام غزالیؒ، رازیؒ، بوعلیؒ، ابن رشدؒ، فارابیؒ، البیرونیؒ، اور کندیؒ، زہد و تصوف میں شیخ جیلانیؒ، بایزید بسطامیؒ فضیل بن عیاضؒ، فاتحین میں محمد بن قاسمؒ، صلاح الدین ایوبیؒ، اور نور الدین زنگیؒ۔ مصنفین میں ابن تیمیہؒ، اور ابن القیمؒ، شعراء ادباء میں مولانا رومؒ، شیخ سعدیؒ، عمر خیام حافظ شیرازی، حکمت دین کے حوالے سے ابن خرمؒ اور شاہ ولی اللہ ایسے نام محض نمایاں افراد نہیں بلکہ یہ گرامی قدر شخصیات ایک پوری تاریخ، بھرپور تہذیب، اور کامل فلسفہ ہیں، اتنا عظیم سرمایہ رکھنے والی قوم اب بھی فتوؤں، مناظروں، شعبدوں، حکایتوں اور افسانوں میں گھری ہوئی ہے، سچ ہے جب مذہب گورکھ دھندا، تاریخ و تحقیق روایت، حقیقت افسانہ، اور علم فرقہ واریت کی بھینٹ چڑھ جائے تو جلیل القدر شخصیتوں کے ساتھ ایسی ہی بے انصافی ہوتی ہے موجودہ معاشرے میں امام حسینؓ کے کام کو اتنی توجہ نہیں مل رہی جتنی ان کے نام پر فرقہ بندی کو مل رہی ہے حالانکہ عظیم شخصیتیں کسی فرقے کا حوالہ نہیں بلکہ پوری قوم کا مقدس ورثہ ہوتی ہیں۔ انہیں مختلف خانوں میں رکھ کر نہیں دیکھا جاتا بلکہ انہیں اپنے عمل و اخلاق کا پیمانہ بنایا جانا چاہیے

''یوم عاشورہ'' اور ''واقعہ کربلا'' ایک دن اور ایک حادثہ نہیں بلکہ ایک بھرپور تاریخ اور حیات آفرین جذبہ ہے جسے محض فضائل و مصائب میں الجھا دیا گیا ہے۔

جناب امام حسینؓ نے اپنے دور میں سیاست کو فرعونی، معیشت کو قارونی اور معاشرت کو یزیدی بنتے دیکھا تو آپؓ نے پوری قوت اور جرات سے صدائے احتجاج اور نوائے انقلاب بلند کی کہ خدا کی اس دھرتی پر خلافت و امارت کے نام پر شخصی آمریت کا تسلط ناقابل برداشت ہے وہ حکومت میں احتساب معاشرت میں اخلاق اور معیشت میں انصاف کے علمبردار تھے کیونکہ ان کے نزدیک سیاست محمدیؐ منافقت سے پاک، معیشت محمدی ﷺ استحصال سے منزہ اور معاشرت محمدی ﷺ لاقانونیت سے مبرا تھی۔ وہ حکم حاکم کے نہیں حکم خدا اور رسول ﷺ کے قائل تھے ان کا عقیدہ تھا کہ خدا کی زمین پر خدا کے سب سے پیارے بندے حضور محمد رسول اللہ ﷺ کی شریعت کے ذریعے خدائی احکام کی پیروی کرنے والے لوگوں کی حکومت ہونی چاہیے نہ کہ جاہلی جذبوں کے ساتھ قومی حکومت قائم کر کے شخصی اطاعت کو رائج کیا جائے۔ یہی وہ جذبہ حریت اور نظریہ انقلاب تھا جو جناب امامؓ کو مدینہ منورہ کے پرسکون ماحول اور مسجد نبوی کی پرنور فضاؤں اور روضہ رسول اللہ ﷺ کی پرکیف قربتوں سے نکال کر لق و دق اور بے آب و گیاہ وادی کی طرف کشاں کشاں لے آیا اور زندگی بھر کی پونجی چٹیل میدان کی نذر کر دی۔

آج تک دنیا کے باطل نظاموں کے ترجمان اس دستور کو رائج کرنے اور اس فلسفے کو منوانے پر تلے ہوئے ہیں کہ طاقت ہی حق ہے مگر جناب امام حسینؓ نے اس روش کے خلاف چلتے ہوئے نعرہ انقلاب بلند کیا کہ طاقت نہیں دراصل حق طاقت ہے اور دنیا نے دیکھ لیا کہ تلواروں کی جنگ جیتنے والے مقدر کی بازی ہار گئے اور بنجر زمین پر گھر کا گھر لٹانے والے انسانیت و حریت کی آبرو بن گئے۔

مدینہ منورہ کا قیام، مسجد نبوی کی امامت، روضہ رسول ﷺ کی مجاورت اور روحانی

سیادت کوئی معمولی اعزاز نہ تھا جس سے جناب امام حسینؓ دستبردار ہو گئے بلکہ یہ سب کچھ اس بات کا حتمی اور بڑا ثبوت ہے کہ یہ ایک عظیم اور تاریخی مشن تھا جس کی تکمیل کے لیے یہ صدمے گوارا کرنے لازم تھے ورنہ کون گوشۂ عافیت کو چھوڑ کر میدان رزم کا رخ کرتا ہے اور کون روح پرور فضاؤں کو ترک کر کے لو کے تھپیڑے سہتا ہے۔ ہمارے مذہبی حلقوں نے واقعہ کربلا کی جزئیات تک کو تو نگاہ میں رکھا، مجالس مصائب پر تو توجہ دی مگر امام پاکؓ کی انقلابی روح اپنے اندر جذب نہیں کی۔

ہُو کا عالم ہو، جبر کا دور دورہ ہو، ہوس زر نے لوگوں کو مصلحت کیش بنا رکھا ہو، آمریت نے رعایا کو بے دست و پا کر دیا ہو، جاہ طلبی زندگی کا مشن اور قربت اقتدار معاشرے کا مجموعی مزاج بن چکا ہو، ایسے میں جناب امامؓ کا نعرۂ قلندرانہ بلند کرنا اور کاخ و ایوان حکومت سے جا ٹکرانا آپؓ کے تاریخی کردار کی بلند مرتبہ مثال ہے۔ جناب امامؓ کے کردار کی اس تاریخی عظمت کے حوالے سے جب ہم اپنے معاشرے کا مجموعی چلن دیکھتے ہیں اور بالخصوص مذہبی گروہ بندی پر نظر ڈالتے ہیں تو اپنی کج فہمی پر ندامت ہوتی ہے۔

امام حسینؓ نے اپنے بے مثال مجاہدانہ کردار کے ذریعے دنیائے جبر میں ہر خطۂ زمین کو کربلا اور ہر دن کو یوم عاشورہ بنا دیا۔ اب قیامت تک دو کردار ایک دوسرے کے آمنے سامنے رہیں گے ایک کردار یزیدی ہو گا جو جبر کی نمائندگی کرتا ہے اور دوسرا کردار حسینیؓ ہو گا جو صبر اور ایثار کی مثال بنا رہے گا، ظاہر ہے اب ہر مسلمان خواہ وہ کسی مسلک کا ہو اپنے لیے حسینیؓ کردار کا انتخاب کرے گا، یعنی جبر کے مقابلہ میں صبر، جفا کے مقابلے میں وفا، استکبار کے مقابلہ میں ایثار، طاقت کے مقابلہ میں استقامت اور منطق العنانی کے مقابلہ میں جرأت ایمانی کا مظاہرہ اور یہی اسوۂ حسینؓ اور درس کربلا ہے۔

☆☆☆☆

امام اعظمؒ ۔۔۔ مجتہد اور مجاہد

گردش لیل و نہار اور رفتار زمانہ نے نہ جانے کتنی تہذیبیں کھنڈر بنا ڈالیں، کتنی سلطنتیں الٹ دیں، کتنے خانوادے مٹا دیئے، کیسے کیسے نامور گمنام بلکہ بے نام بنا دیئے، صدیوں کی شوکت وسطوت گھڑیوں میں مرقع عبرت بن گئی، گرانڈیل اور قد آور لوگ پیوند خاک ہو گئے، روز وشب کی کروٹوں نے بڑے بڑوں کے سر چکرا دیئے اور وقت کی آندھیوں نے ہمالیہ جیسے لوگ راکھ بنا کر اڑا ڈالے، جمشید وفریدوں سے لے کر بہادر شاہ ظفر تک سبھی طاقچہ نسیاں کی نذر ہو گئے، کسی مورخ کا دھیان پڑ جائے تو دو چار دن کے لیے ان لوگوں پر پڑی ہوئی گرد جھاڑ دیتا ہے اور یہ چہرے کسی حد تک قابل شناخت ہو جاتے ہیں لیکن اس کے بعد پھر وہی خاموشی اور کوچہ فراموشی!

مگر ان کے مقابلے میں کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو کبھی سریر آرائے سلطنت ہوئے اور نہ وارثان تاج وتخت ٹھہرے، نہ کجکلاہ بنے نہ عالم پناہ کہلائے نہ جہاندار و جہانگیر کا لقب اختیار کیا اور نہ ''ظل سبحانی'' بننے پر اصرار کیا، شاہی قلعے کے جھروکوں میں بیٹھ کر دیدار عام کرانے کا شوق چرایا اور نہ کسی ٹکسال میں اپنے نام کا سکہ ڈھالنے کا حکم جاری کیا۔

بے شک یہ لوگ سریر آرائے سلطنت نہیں ہوئے لیکن کروڑوں لوگوں کے دل و دماغ پر آج بھی ان کی حکومت ہے تخت وتاج تو انہیں کبھی نہیں ملا مگر عقیدتوں کا خراج آج تک وصول کر رہے ہیں، کجکلاہی اور عالم پناہی سے محروم رہے مگر خدا شناسی اور خود

آگاہی ان کے مقسوم میں آئی شاہ جہاں و عالمگیر نہ سہی البتہ سلطنت علم کے ولی و امیر ٹھہرے، یہ ''ظل سبحانی'' تو نہیں کہلائے البتہ نعمت ایمان و شعور ان پر ارزانی ہوئی۔ قصر وایوان کے جھروکے ان پر وا نہیں ہوئے تاہم علم وعرفان کے کوچے ان کے دم سے آباد رہے، کسی شاہی ٹکسال میں ان کے نام کا سکہ نہیں ڈھلا مگر جہان دانش و حکمت میں ان کے کام کا ڈنکا بجتا رہے، روح عصر ان کے قابو میں ہے اور مرور زمانہ ان کی عظمت کا فسانہ سنا رہا ہے، ایسے خسروان بے کلاہ اور مردان حق آگاہ میں ایک نہایت ہی معتبر اور محترم امام اعظم ابو حنیفہؒ کا ہے جسے صدیوں کی الٹ پھیر ابھی تک صفحہ عزت اور لوح شہرت سے محو نہیں کر سکی، امام اعظمؒ کی شہرت کے کئی پہلو ہیں، ایک مستقل دبستان فقہ کے بانی، صاحب نظر اور شعور عصر سے بہرہ ور مجتہد، روایت و درایت کے مجمع البحرین، مسند تدریس کے کامیاب معلم و مدرس، فقہاء و قضاۃ کی تعلیم و تربیت کے حوالے سے ایک پورا ادارہ، علم و تحقیق کے تقاضوں اور باریکیوں سے صد فیصد آگاہ و آشنا، یہ سب معتبر حوالے اپنی جگہ لیکن حضرت امامؒ کا اصل کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے صرف علمی و فقہی اجتہاد تک خود کو محدود نہیں کیا بلکہ سیاسی و انقلابی جہاد تک اپنے کام کو پھیلا دیا۔

عام مشاہدہ تو یہی ہے کہ جو صاحب تصنیف ہو وہ کتابوں کے ہجوم میں گم رہتا ہے اور لوگوں سے ربط و ضبط اس کے لیے بار گراں، جو محقق ہو وہ پوری عمر کتابوں کی گرد جھاڑنے میں کھپا دیتا ہے معاشرے کی روش سدھارنے کو وہ کار فضول سمجھتا ہے، جو صوفی ہو وہ فقط اپنے گریبان میں سارے جہان کا مشاہدہ کرنے میں مشغول رہتا ہے، وہ مکاشفے میں اس قدر غرق ہوتا ہے کہ اسے حکمرانوں کے محاسبے کی فرصت ہی نہیں ملتی، جو محدث ہو وہ روایت اور اسماء الرجال کا ماہر تو ہوتا ہے مگر رجال کار پیدا کرنا اس کے بس سے باہر ہوتا ہے، جو مفسر ہو وہ رازی و صاحب کشاف تو بن جاتا ہے مگر عملی زندگی کے راز اس پر منکشف نہیں ہو پاتے، جو فقیہہ ہو وہ مسائل کی باریکی پر خوب نگاہ جمائے رکھتا ہے مگر امت پر پڑنے والے مصائب بالعموم اس کی نگاہ سے اوجھل رہتے ہیں اور

جو مورخ ہو وہ تاریخ کو تو خوب لکھتا ہے مگر تاریخ بتانا اسے یاد نہیں رہتا، لیکن امام اعظمؒ فقہی جزئیات میں انہماک کے ساتھ ساتھ حکومتی لغویات کا ادراک بھی رکھتے تھے مکتب و مدرسہ کی فضاء میں رہتے ہوئے بھی حاکم و خلیفہ کے انداز و اطوار سے کبھی غافل نہیں رہے، فقہی اجتہاد بھی زوروں پر رہا اور ساتھ ہی سیاسی جہاد بھی برسوں جاری رکھا۔

امام اعظمؒ نے اپنی پوری زندگی میں علم کو کبھی ذہنی ورزش اور دماغی تفریح کے طور پر استعمال نہیں کیا بلکہ اس سے اصلاح فرد و اجتماع اور لوگوں کے جذبہ عمل کو مہمیز دینے کا کام لیا، امام اعظمؒ نے فقہ اکیڈمی قائم کی تو اس لیے کہ یہاں سے لوگ شعور دین اور رموز قانون سے آراستہ ہو کر میدان حیات میں مردان جہاد بن کر کام کریں اور حکومتوں کے لیے ایک مکمل اسلامی قانونی نظام فراہم کر دیا جائے تاکہ وہ یہ کہہ کر اپنی مرضی کو قانون کا درجہ نہ دے سکیں کہ کوئی مکمل اسلامی قانونی ڈھانچہ موجود نہیں ہم آخر نظام حکومت چلائیں تو کیسے چلائیں؟ حضرت امامؒ نے اپنے سیاسی کام کو تین بنیادوں پر استوار کیا، ایک یہ کہ دین و سیاست کوئی جداگانہ شعبے نہیں کہ ایک دوسرے سے اجنبی ہو کر رہیں۔

دوسرے یہ کہ اپنی سیاسی جدوجہد کو ذاتی طور پر حصول حکومت کا ذریعہ نہیں بنایا اور تیسرے یہ کہ کسی بھی حکومت کے اس حق کو تسلیم نہیں کیا کہ اہل علم و تقویٰ صرف اپنی علمی و روحانی خدمات حکومت کے سپرد کر دیں بلکہ آپ نے عملاً اہل علم و تقویٰ کی حکومت قائم کرنے کے لیے خفیہ اور اعلانیہ امداد کی اور ہر مرحلے پر عافیت کے مقابلے میں عزیمت، مصلحت کے مقابلے میں استقامت اور مصالحت کے مقابلے میں مزاحمت کا انداز اپنایا۔

[حض]رت امامؒ کا سارا علمی و فقہی کام خود پتہ دے رہا ہے کہ انہوں نے یہ ساری مغز [م]اری محض فنی و تکنیکی چاند ماری کے لیے نہیں کی تھی بلکہ اسلامی قانون کے مطابق نظام [ح]کومت استوار کرنے اور چلانے کے لیے محنت کی تھی، یہی وجہ ہے کہ فقہ حنفی تقریباً سوا

پانچ سو سال تک مختلف حکومتوں کے ہاں باقاعدہ حکومتی و ریاستی مجموعہ قانون کے طور پر نافذ رہی، اور برصغیر پاک و ہند میں انگریز حکومت کے آنے تک فقہ حنفی بطور پبلک لاء معروف و مقبول رہی۔

گویا امامؒ کے ہاں مکتب و مدرسہ ہو، حرف و لفظ ہو، تعلیم و تعلم ہو، تحقیق و تصنیف ہو، یہ سب کچھ فی الاصل اسلامی نظام کے قیام کے ذرائع ہونے چاہئیں، نہ یہ کہ حکومت چاہے کسی کی ہو، اور نظام خواہ کیسا ہو، علماء و فقہاء کو صرف قال اقول کے گنبد میں بند ہو کر رہنا چاہیے۔

چنانچہ جب عبداللہ نفس زکیہؒ اور ابراہیم نفس رضیہؒ نے پورے ملک میں اسلامی انقلاب کے برپا کرنے اور اسلامی نظام کے احیاء کے لیے تحریک اٹھائی تو آپ نے تمام فقہی حیل و لطائف کو طاق پر دھر دیا اور جہد کے مواقع اور کوائف پر اپنی توجہ مرکوز کر دی۔

بنوامیہ کی حکومت قاہرہ نے جب حضرت زیدؒ کو شہید کیا تو آپ نے ان کی حمایت میں فتویٰ جاری کیا اور لکھا "حضرت زید کا اس وقت اٹھ کھڑے ہونا حضورؐ کی بدر میں تشریف آوری کے مترادف ہے" نفس زکیہؒ کی حمایت میں آپ کو بہت بڑی قیمت ادا کرنی پڑی، لیکن آپ کو پہلے دن سے معلوم تھا کہ وہ جو کچھ کر رہے ہیں ایک ایسے ہی انقلاب اور نظام کے لیے جہد و کاوش کر رہے ہیں اب اگر اس انقلاب اور نظام کے امکانات روشن ہوئے ہیں تو انہیں اپنا وہ سارا اثاثہ بیچ بازار لے آنا چاہیے جو اس نظام پر نچھاور کرنے کے لیے عمر بھر فراہم کیا تھا،

آپ نے عمر بھر خود کو تو کسی بھی حکومتی عہدے کی آلائش سے پاک رکھا، لیکن حکومتی اصلاح کے کام سے خود کو باز نہ رکھ سکے۔

ہر دور کی حکومت کے پاس لوگوں کو جھکانے اور دبانے کے دو ہی حربے ہوتے ہیں، طمع اور خوف، بعض لوگ سونے کے جال میں پھنس جاتے ہیں اور بعض لوہے کی

سلاخوں سے ڈر جاتے ہیں۔

ہمارے ممدوح ان دونوں حربوں میں بھی کامگار و سرخرو رہے، نہ خود کبھی اقتدار کے طالب ہوئے اور نہ کبھی جاہ پرستوں کے اقتدار پر قانع ہوئے بلکہ ان کے خلاف ہر موقع پر آواز بلند کیے رکھی۔ اموی دور میں عراق، ایران اور خراسان کے متحدہ صوبے کے گورنر ابن ہبیرہ نے حضرت امامؒ کے ایک دوست ربیع کے ذریعے آپ کو اپنے صوبے میں من پسند اور بااختیار وزارت کی پیش کش کی مگر آپ نے انکار کر دیا تو اکابر علماء اور معاصر فقہاء کا ایک پورا وفد آپ کو سمجھانے آیا کہ ہم لوگ تمھیں خدا کی قسم دیتے ہیں کہ تم اپنے آپ کو تباہی میں نہ ڈالو ہم لوگ آخر تمھارے بھائی ہیں، حکومت کے اس تعلق کو ہم بھی پسند نہیں کرتے لیکن اس کے علاوہ چارہ کار بھی نہیں۔ آپ نے جواباً ارشاد فرمایا:۔

"یہ ملازمت تو خیر بڑی چیز ہے اگر حکومت مجھ سے چاہے کہ وسط شہر کی مسجد کے صرف دروازے شمار کر کے انھیں بتا دوں تو میں اس کے لیے بھی تیار نہیں"

اس کے علاوہ بھی متعدد مواقع پر آپ کو اسی نوع کی ترغیبات سے ورغلایا گیا مگر آپ کا جواب ایک ہی رہا کہ ظلم سے مصالحت بجائے خود ظلم ہے۔

آپ کے اس طرز عمل سے حکمرانوں کا آئینہ پندار اور آبگینہ غرور بار بار چھنا کے سے ٹوٹتا رہا آپ حوصلہ نہیں ہارے مگر حکمرانوں کا پیمانہ صبر چھلک پڑا اور پھر وہی ہوا جو عہد جبر کا معمول ہے یعنی تشدد، تعذیب، تعزیز، کوڑے، جیل اور پھانسی۔

جو رکے تو کوہ گراں تھے ہم جو چلے تو جاں سے گزر گئے
رہ یار ہم نے قدم قدم، تجھے یاد گار بنا دیا

جب آپ کو عہدہ قضا پیش کیا گیا تو آپ نے فرمایا "میں خود کو اس عہدے کا اہل اور موزوں نہیں پاتا" تو جھٹ سے خلیفہ نے کہا "آپ جھوٹ بولتے ہیں" آپ نے فرمایا آپ کے اس تبصرے نے میری بات کی مزید توثیق کر دی کہ جھوٹا آدمی منصب

قضا کے لیے کبھی موزوں نہیں ہوتا۔

دنیا دار تو معمولی عہدوں کے لیے نجانے کیا کچھ گروی رکھ دیتے ہیں لیکن یہاں چیف جسٹس کا عہدہ طشتری میں رکھ کر پیش کیا جا رہا ہے مگر آپ اسے ہاتھ سے جھٹکنے کے بجائے پاؤں سے ٹھکرانے میں لمحے بھر کا توقف نہیں کرتے۔

آخری حربے کے طور پر امام اعظمؒ کو وزارت عدل و انصاف دینے کی بات کی گئی مگر آپ نے اسے بھی خلیفہ وقت کی چالبازی سمجھا اور آپ نے اپنے طور پر یہ سوچا کہ یا تو میں یہ عہدہ قبول کر کے اپنی جان بچا لوں لیکن اس سے عمر بھر کی پونجی لٹ جائے گی، یا پھر صاف انکار کر کے خلیفہ منصور کے عتاب و انتقام کا ہدف بنوں، آپ نے راہ عزیمت اختیار کی۔

چنانچہ آپ نے کوفہ کی جامع مسجد میں اپنے ایک ہزار ممتاز شاگردوں کا اجتماع بلایا اور آپ نے وہ تقریر ارشاد فرمائی جس کے ایک ایک حرف پر آج تک زمانہ صداقت کی مہر ثبت کرتا چلا آ رہا ہے، آپ نے فرمایا:۔

''میرے دل کی مسرتوں کا سارا سرمایہ صرف تم لوگ ہو، تمھارے وجود ہی میرے حزن و غم کے ازالے کی ضمانت ہیں، میں نے تمہیں اس قابل بنا دیا ہے کہ لوگ تمھارے نقش پا کو ڈھونڈھ لیں گے تمہارے ایک ایک لفظ کی جستجو کریں گے میں نے لوگوں کی گردنوں کو تمہارے لیے جھکا دیا ہے اور ان کے ذہنوں کو ہموار کر دیا ہے''

بعد ازاں چالیس شاگردانِ خاص کو مخاطب کیا:۔

''تم چالیس میں سے ہر ایک اس قابل ہے کہ وہ منصب قضا سنبھال سکے، اور دس تو وہ ہیں جو قاضی نہیں قاضیوں کے معلم اور مربی بننے کے اہل ہیں، لیکن میری تمنا یہ ہے کہ تم علم کو محکوم ہونے کی ذلت سے بچائے رکھنا''

اس رویے کے بعد وہی کچھ ہوا جو ہونا چاہیے تھا امام صاحب پر کوڑے برسائے گئے، اور آپ کو حوالہ زنداں کیا گیا، آپ جیل میں اپنے پاؤں سے چل کر گئے مگر نکلے

لوگوں کے کندھوں پر!

وفات کی اطلاع کسی کو نہ دی گئی، صرف چار پانچ لوگ آپ کا جنازہ اٹھا کر باہر آئے، مگر وہ دن اور آج کی ساعت، ابو جعفر منصور جیسا باجبروت خلیفہ زمانے کی گرد میں دب کر رہ گیا ہے مگر امام اعظم ابو حنیفہؒ تاریخ کے ماتھے کا جھومر بن کر چمک رہے ہیں، وہ دنیا میں بے شک نہیں رہے مگر اب تک دلوں میں رہ رہے ہیں:۔

☆☆☆☆

خاورِ تصوّف کے رخشندہ آفتاب

اولیاء وصوفیاء کی پوری جماعت میں سب سے زیادہ محبوبیت اور شہرت جس مرد خدا کے حصے میں آئی ہے وہ سیدنا شیخ عبدالقادر جیلانیؒ ہیں کیا معلوم اور کیا خواص دونوں طبقوں میں آپ کو یکساں اور لازوال عزت حاصل ہے آپ کو زمانے بھر کے علماء اور صلحاء نے جو مختلف القاب دیئے ہیں۔ ان میں ایک معروف لقب ''محی الدین'' ہے بلاشبہ اس لقب کی قبائے زیبا آپ کی قامت رعنا پر راست آئی ہے۔ شیخ الاسلام عزالدین بن عبدالسلامؒ کا قول ہے۔

''آپ کا وجود اسلام کے لیے ایک باد بہاری تھا جس نے دلوں کے قبرستان میں نئی جان ڈال دی'' جس زمانے میں آپ وارد بغداد ہوئے، یہ وہ دور تھا جب بغداد کی فضا پر علم کی خشکی کا لیپ چڑھا ہوا تھا بحث ومناظرہ کا بازار گرم تھا، نئے فرقے وجود میں آرہے تھے، اور نئے نکتے برآمد ہورہے تھے، ہر شخص کتاب خواں تھا مگر صاحب کتاب سے نسبت کی فکر نہ تھی، الفاظ وحروف کا ایک ذخیرہ تھا جس میں ہر ایک گم تھا کسی کو سراغ زندگی پانے کا شوق نہ تھا، لغت ہائے حجازی کے قارون بہت تھے مگر گدائے کوئے حجاز کوئی نہ تھا، ہر طرف کتابوں کے انبار لگے تھے لیکن دل کا ورق الٹنے کی کسی کو توفیق نہ تھی۔

مناظرے کی محفلیں طلوع صبح تک رہتیں مگر شب تار زیست محرومِ سحر تھی، مسند تدریس پر ترش رو معلم فروکش تھے جب کہ ضرورت نہاں خانہ دل میں اتر جانے والے

مرد خلیق کی تھی، محراب و منبر پر شعلہ جان قابض تھے جبکہ اہل بغداد شیریں مقال واعظ کے منتظر تھے۔ اسی کشیدہ و کبیدہ ماحول سے بالآخر امام غزالیؒ تنگ آ کر جامعہ نظامیہ کو خیر باد کہتے ہوئے شہر سے نکل کھڑے ہوتے ہیں، یہ ٹھیک وہی سال تھا کہ امام غزالی علم کی کرسی فخر چھوڑتے ہیں اور شیخ جیلانیؒ مسند فقر پر جلوہ افروز ہوتے ہیں۔ امام غزالی نے جس منصب کو خوشی خوشی چھوڑا لوگ گھل گھل کر اس کی آرزو کرتے ہیں، صرف چونتیس برس کی عمر میں غزالی بغداد کی جامعہ نظامیہ کے سربراہ مقرر ہوتے ہیں، یہ ایک عالم کے لیے سب سے خوبصورت لمحہ اعزاز اور سب سے بڑا نقطہ کمال تھا۔ امام کے ایک معاصر عبدالغافر فارسی کے بقول ''ان کی علمی صلاحیت کے سامنے امراء وزراء تو کیا بارگاہ خلافت کی شان و شوکت ماند پڑ گئی تھی''۔

قدرت کا اپنا نظام العمل ہوتا ہے کہ امام غزالی ''شہر بغداد کو دولت علم سے تونگر بنا گئے اور شاہ جیلانیؒ فضائے بغداد کو بوئے فقر سے معطر کرنے کے لیے تشریف لے آئے، آپ بغداد میں پہنچے تو شہر کا رنگ یکسر بدل گیا، ''سوزِ دماغ'' کی جگہ ''سوز جگر'' نے لے لی۔ لوگ دماغ جلانے کے بجائے سراغ پانے میں لگ گئے، علم کی شعبدہ بازی چھوڑ کر طریق شہبازی سیکھنے لگے، علم کی منزل نہیں چراغ راہ سمجھنے لگے، ''مکتب کی کرامت'' کا دھیان کم ہوا اور ''فیضانِ نظر'' کا رجحان بڑھ گیا، دنیا نے امام غزالی کا جاہ و جلال دیکھا تھا اب انہیں سرکار بغداد کا نظارہ جمال کرنا تھا، غزالی نے نظامیہ یونیورسٹی کی پرشکوہ فضا میں خلیفہ وقت کو آنے پر مجبور کیا مگر حضرت شیخ کی گھاس پھونس کی کٹیا تاج و تخت اور لشکر و سپاہ کو مات دے گئی۔ آپ کے وجود سے جس قدر اسلام اور اہل اسلام کو عزت اور تقویت ملی۔ اس کا مقابلہ ہزاروں لاکھوں انسانی نفوس نہیں کر سکتے۔

قدرت نے اپنی نیرنگیوں کا تماشا دکھانے کے لیے آپ کا خاص طور پر انتخاب فرمایا۔ اور آپ نے جس طرح قدرت کے ارادوں کو مکمل کیا قدرت کو بجا طور پر اپنے انتخاب پر ناز رہے گا، سیاسی سطح پر خلافت عباسیہ مرکز گریز رجحانات کے باعث پریشان

تھی، آل سلجوق اپنی حکومت الگ سے قائم کر چکے تھے باطنیہ فرقے کی ریشہ دوانیاں اور تشدد آمیز کارروائیاں اپنے عروج پر تھیں، ایسے میں روحانی استقلال کا تو مذکور کیا؟ عباسی شہنشاہ اپنے تمام تر ملکی و ریاستی وسائل سے جو مرکزیت حاصل نہ کر سکے۔ حضرت محبوب سبحانی کی ذات فقر و فاقہ کے باوجود مرکزی حیثیت کی حامل بن گئی۔ آپ کی حیات مبارکہ میں پانچ عباسی خلفاء گزرے آپ نے اور دنیا نے خلیفہ منظہر باللہ کو مسند اقتدار پر دیکھا۔ پھر خلیفہ مترشد باللہ کو سریر آرائے سلطنت ہوتے دیکھا، اس کے بعد خلیفہ راشد باللہ آیا، بعد ازاں خلیفہ مقتضی اومراللہ آتا ہے اور پھر خلیفہ مستنجد باللہ تخت حکومت پر متمکن ہوا۔ یہ لوگ آئے اور چلے گئے۔ اہل اسلام جس مصیبت میں تھے اسی میں پھنسے رہے۔ کشتی اسلام جس منجدھار میں تھی وہیں ہچکولے کھاتی رہی۔ نہ خلفاء کا اول بدل کام آیا اور نہ ہی حکومتی وسائل بلاؤں کو ٹال سکے۔ ایک آپ کا وجود مسعود تھا۔ جس نے لوگوں کی مایوسی کو خوش امیدی بخشی اور سفینہ اسلام کو ساحل عافیت پر لگا دیا، مسلمانوں جو سیاسی افراتفری اور ملوکانہ مہم جوئی کا شکار تھے انہیں روحانی مرکزیت نصیب ہوگئی۔

حضرت شیخ کو قدرت نے حلقہ صوفیاء میں جامعیت کے مقام پر فائز کیا تھا، حسب ونسب کے اعتبار سے آپ حسنی سیّد تھے مسند رشد و ہدایت پر بطور مرشد کامل تشریف فرما تھے، قلم و قرطاس کی دنیا میں مانے ہوئے انشاء پرداز تھے آپ کے سحر خطابت کی ایک دنیا اسیر تھی، روحانیت میں نہ کوئی ثانی ہوا ہے اور نہ ہوگا اولیاء کی جماعت کو اگر ستاروں کا ہار تصور کیا جائے تو آپ اس کا چاند تھے، تصوف کو اگر ایک کتاب فرض کیا جائے تو آپ اس کا عنوانِ جلی تھے۔ روحانیت کو اگر ایک شمع سے تشبیہ دی جائے تو آپ اس کی لو تھے، تجدید و احیائے دین کے کام کو اگر شاداب چمن سے تعبیر کیا جائے تو آپ اس کا گل سرسبد تھے، شکوہ علم اور غیرت فقر کو اگر کوہ طور کا نام دیا جائے تو آپ اس کا جلوہ نور تھے۔ صف اولیاء میں آپ ایسا جامع الصفات فرد عرب و

عجم میں نہیں ملے گا، یہی سبب ہے کہ دنیا کبھی آپ کو ''شہنشاہ بغداد'' کے نام سے یاد کرتی ہے کبھی اس کی نوک زبان پر ''شاہ جیلانی'' جیسا لقب آتا ہے دنیا کا ایک بڑا حصہ آپ کو ''محبوب سبحانی'' کہتا ہے خلق خدا ''غوث اعظم'' بھی کہتی ہے۔ لاکھوں لوگ ''شیخ الاسلام'' جیسے پر عظمت خطاب سے یاد کرتے ہیں اور خواص و عوام میں ''پیرانِ پیر'' کے نام سے آپ ہی مشہور ہیں۔

آپ کی شش حیات دینی و روحانی خدمات کو دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ حق تعالیٰ نے اپنے کام کے لیے خاص طور پر آپ کو پیدا فرمایا اور وہ تمام خوبیاں دے کر اس کام کے لیے منتخب فرمایا جو دین کی نشر و اشاعت، مخلوق کی ہدایت، اور بھولے بھٹکوں کی رہنمائی کے لیے ضروری تھیں، تدریس کی مہارت، خطابت میں جاذبیت، شخصیت میں کشش اور ملائمت، بات میں تاثر اور بلا کی ذہانت، انداز بیان میں دلکشی اور حکمت اور فصاحت و بلاغت جیسی خوبیاں منعم حقیقی نے آپ کو ازراں کی تھیں۔

آپ کے ایک ہمعصر شیخ جبائی کہتے ہیں:

''مجھ سے حضرت شیخ نے ایک روز فرمایا کہ میری تمنا ہے کہ زمانہ سابق کی طرح جنگلوں اور صحراؤں میں رہوں نہ مخلوق مجھے دیکھے نہ میں اس کو دیکھوں، لیکن اللہ تعالیٰ کو اپنے بندوں کا نفع منظور ہے میرے ہاتھ پر پانچ ہزار سے زائد یہودی اور عیسائی مسلمان ہو چکے ہیں، عیاروں اور جرائم پیشہ لوگوں میں ایک لاکھ سے زائد توبہ کر چکے ہیں اور یہ اللہ تعالیٰ کی بہت بڑی نعمت ہے''

شان تدریس کا یہ عالم تھا کہ آپ دیگر روحانی مشاغل کے ساتھ ساتھ اپنے مدرسہ میں روزانہ تفسیر، حدیث، فقہ اور اختلافات آئمہ کا سبق پڑھاتے، اصول فقہ اور نحو کی کلاس بھی خود لیتے، نماز ظہر کے بعد تجوید کی تعلیم دیتے۔ علاوہ ازیں افتاء کا کام بھی سر انجام دیتے، کوئی آپ کے یہ معمولات دیکھتا تو یقیناً کہہ اٹھتا کہ لفظ و حرف میں محو اور قرطاس و کتاب میں مستغرق یہ شخص کبھی دوسرے سے بات کرنا تو کجا خود کلامی کی

فرصت بھی نہیں پاتا ہوگا مگر یہ دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ آپ جونہی منصب تدریس سے اتر کر مسند تلقین پر جلوہ گر ہوتے تو ستر ستر ہزار تک لوگوں کے اجتماع سے اس سکوں اور وقار سے مخاطب ہوتے کہ کسی کو سرگوشی کا ہوش ہوتا اور نہ کھنکارنے اور کھانسنے کی فرصت ہوتی، یوں محسوس ہوتا کہ لوگوں کے سروں پر پرندے بیٹھے ہیں جن کے اڑ جانے کے خوف سے یہ لوگ چپ سادھے ہوئے ہیں آپ کے مواعظ اور ملفوظات کو قلمبند کرنے کے لیے بعض اوقات چار چار سو دواتیں مجلس میں لائی جاتیں۔

عبداللہ یافعیؒ کا کہنا ہے کہ آپ کے خطاب کی تاثیر اور سحر انگیزی کا یہ عالم ہوتا کہ لوگ پھڑک کر مر جاتے اور آپ کی مجلس سے کئی بار جنازے اٹھائے گئے۔

آپ کا وعظ پیشہ ورانہ نہیں مجذوبانہ رنگ کا ہوتا تھا جملے منہ سے نکل کر ہوا میں تحلیل نہیں ہوتے تھے بلکہ تیر بن کر دل میں ترازو ہو جاتے تھے، آپ کا خطاب دھواں دار نہیں ہوتا کہ ماحول کو اور دھندلا دے بلکہ اس میں شرارے چھپے ہوتے تھے جو دلوں میں موجود حرص و حسد کے خس و خاشاک کو جلا کر پھونک ڈالتے، ہر بات زبان سے ہی نہیں کہتے تھے کچھ کام آنکھوں کی روشنی اور دل کی پاکیزگی سے لیتے، یحییٰ بن نجاح ادیب کا بیان ہے:

"ایک دفعہ میں نے ارادہ کیا کہ آج حضرت شیخ کی مجلس میں تائب ہونے والے شخص شمار کروں گا جب وقت مجلس میں حاضر ہوا تو میں نے کپڑوں میں ایک دھاگہ چھپا لیا جونہی حضرت شیخ کو توبہ کی تلقین فرما کر اس کے بال کاٹتے میں دھاگے میں ایک گرہ لگا دیتا، تھوڑی دیر بعد آپ نے میری طرف دیکھا اور فرمایا عجیب بات ہے میں گرہیں کھولتا ہوں اور تم لگاتے جا رہے ہو"

آپ نے صرف واعظانہ کام ہی نہیں کیا مجاہدانہ سرگرمیاں بھی آپ کی شخصیت کا حصہ رہیں اگرچہ آپ نے کبھی براہ راست سیاست میں حصہ نہیں لیا، نہ ہی قرب شاہی کی آرزو کی، بلکہ آپ کبھی کسی حاکم سے ملنے نہیں گئے۔ اس کے دستر خواں پر نہیں ہاں

البتہ کئی بار خلفاء اور وزراء آپ کے در دولت پر حاضر ہوئے وہ ہاتھ چومتے مگر آپ انہیں جھٹک دیتے اور ان کی روش ستم پر اپنی ملامت کرے، ایک بار خلیفہ مقتفی اومر اللہ نے ابوالوفاء یحییٰ بن سعید کو قاضی مقرر کر دیا آپ کو معلوم ہوا تو برسر منبر فرمایا:

”تم نے مسلمانوں پر ایک ایسے شخص کو حکمران بنایا جو اظلم الظالمین ہے کل قیامت کو اس رب العالمین کو کیا جواب دو گے جو ارحم الراحمین ہے۔ اس جلال آمیز خطاب کی بازگشت قصر خلافت میں بھی سنی گئی اور خلیفہ نے فوراً اسی قاضی کو معزول کر دیا۔

آپ کے زہد کا یہ عالم تھا کہ آپ کے لیے سونے کی ڈبی میں کوئی کشش اور مٹی کے ڈھیلے میں کوئی نفرت نہ تھی، آپ کو کسی چیز کے پانے کے بے قراری نہ تھی اور نہ ہی چھن جانے کا خوف دل میں سمایا رہتا، بلکہ خالی ہاتھ دل کی خوشی کا راز پا چکے تھے۔ ایک بار دوران مجلس اطلاع ملی کہ آپ کا فلاں تجارتی جہاز ڈوب گیا ہے آپ نے تھوڑی دیر توقف کر کے فرمایا ”الحمد اللہ“ کچھ ہی دیر بعد کسی نے آ کر کہا کہ یا حضرت وہ خبر غلط تھی، جہاز صحیح سالم کنارے لگ گیا ہے آپ نے پھر توقف کیا اور کہا ”الحمد اللہ“ حاضرین کے دریافت کرنے پر فرمایا کہ پہلی خبر سن کر میں نے دل کو ٹٹولا تو جہاز اور اسباب ڈوبنے کا ذرا بھی ملال نہ ہوا تو میرے منہ دے الحمد اللہ نکلا، اور جہاز کے صحیح

ایک اور موقع پر ارشاد فرمایا:

''دنیا ہاتھ میں رکھنی جائز، جیب میں رکھنی جائز، کی اچھی نیت سے جمع کرنا جائز مگر دل میں رکھنا ہر گز جائز نہیں دروازے پر اس کا کھڑا ہونا جائز لیکن دروازے سے آگے گھسنا نہ جائز ہے اور نہ باعثِ عزت''

مفتوح الغیب میں فرماتے ہیں:

''خلق کی حقیقت یہ ہے کہ جب تو اللہ کے ساتھ معاملہ کرے تو مخلوق درمیان میں حائل نہ رہے اور جب مخلوق خدا سے معاملہ کرے تو نفس کو آڑے نہ آنے دے''

حضرت شیخ ایسے لوگوں کے بارے میں پڑھ کر انسان اپنے اندر عجیب سی کیفیت محسوس کرتا ہے ایک طرف وہ دارا و سکندر کے وارثوں کو دیکھتا ہے تو مرقع عبرت نظر آتے ہیں اور دوسری طرف وہ بوذرؓ و مسلمان کے جانشینوں پر نظر ڈالتا ہے تو وہ مینارہ عظمت دکھائی دیتے ہیں، تاج زر ملیامیٹ ہو گئے مگر خرقہ فقر کا ایک پیوند بھی بوسیدہ نہیں ہوا۔

انوکھی وضع ہے سارے زمانے سے نرالے ہیں
یہ عاشق کون سی بستی کے یا رب رہنے والے ہیں

☆☆☆☆

محمد بن قاسم ۔۔۔ محسن سندھ

ہمارے معاشرے میں "جدت طرازی" محض ایک شوق ہی نہیں باقاعدہ روگ کی شکل اختیار کر چکی ہے، مذہب کو دیکھیں تو نئے سے نئے عنوان کے ساتھ تحریکیں اٹھ رہی ہیں، سیاست پر نظر ڈالیں تو عجوبے رونما ہو رہے ہیں، معاشرے کا جائزہ لیں تو رنگ برنگ تجربے کئے جا رہے ہیں، رہن سہن میں نت نئے فیشن داخل ہو رہے ہیں، فکری دائروں میں ٹیڑھی میڑھی لکیروں کا اضافہ ہو رہا ہے، لگتا ہے تازہ ہوا کے شوق میں ساکنان گھر کی دیواروں میں اتنے در نکالیں گے کہ دیوار ہی گر پڑے گی۔

اصولاً جدت طرازی بری بات نہیں بشرطیکہ عنوان فتنہ پردازی نہ ہو، کوے کی دم میں سرخاب کا پر ٹانکنا جدت افروزی نہیں سراسر بدذوقی ہے، مثبت کام چونکہ وقت اور محنت مانگتا ہے اس لیے دیر میں نام پیدا ہوتا ہے، وقت کی ہمیں قدر و قیمت نہیں اور محنت ہماری عادت نہیں، اس لیے ہر شعبے میں "بہ عنوان جدید" داخل ہو کر ہم اپنی محرومی کی تلافی کرتے ہیں، دوسروں کو لاکھ اذیت ہو مگر ہماری شخصیت اسی طرح ابھرتی ہے "ماں بولی" کے نام پر "زبان درازی" حقوق کی آڑ میں فتنہ طرازی، برادری کے عنوان سے سیاست بازی، اور کلچر کے پردے میں مغرب نوازی یہ سب اسی مرض کی علامتیں ہیں، جو ہمیں من حیث القوم لاحق ہے، ارباب فکر و نظر اس امر سے آگاہ ہیں کہ ایک عرصے سے سندھ میں "داہر ازم" کا پرچار ہو رہا ہے، وہ سندھ جسے "باب الاسلام" ہونے کا لافانی اعزاز حاصل ہے، اسی وادی مہران کے چند دم بریدہ دانشور اپنا رشتہ

اسلام سے کاٹ کر پرانی ہندو راجہ شاہی کے ساتھ جوڑنا چاہتے ہیں، یہ الگ بات ہے کہ تمام تر ابلیسی منطق کے باوجود اہالیان سندھ کو یہ فکر ہضم نہیں ہو رہی اور یہ فکر ہضم بھی کیسے ہو کہ کہاں اسلام کی آفاقی روایات اور کہاں ہندومت کی ضمنیات؟ زمانہ بڑی برق رفتاری سے نئے سے نئے افق ڈھونڈھ رہا ہے اور مہر و ماہ پر کمندیں ڈال رہا ہے وہ اپنی پیٹھ پر ان پشتاروں کو کہاں تک لادے پھرے گا؟ آفاقیت پسند عصر جدید کیوں کر علاقائیت میں بند رہ سکے گا؟ یہ دور راجوں کے احیاء کا نہیں کائناتی رازوں کے افشاء کا دور ہے اسلام ہی وہ دین ہے جس نے کائنات کی اس مستور حقیقت پر سے پردہ اٹھایا، کہ یہ نسل و رنگ کے بکھیڑے، یہ حدود ثغور کے جھگڑے، یہ صوبہ و علاقہ کے فتنے اور یہ زبان و وطن کے مناقشے اس کائنات کے خالق کو نہ مرغوب ہیں اور نہ مطلوب، جب خدا اور بندے میں کوئی حجاب نہیں تو بندوں نے اتنے نقاب کیوں اوڑھ رکھے ہیں؟ جس سے انسانیت کا اصل چہرہ پہچاننے میں دقت پیش آ رہی ہے، انسان کا اصل رخ بندگی کا ہے لیکن وہ بندگی رب کی ہے، باقی ان میں آپس کا تعلق بھائی بندی کا ہے بندگی کا نہیں، یہ دین مروت کے خلاف سازش ہے کہ کوئی گورا بن کر کالے کو لتاڑے، کوئی عربی بن کر عجمی کو مارے، کوئی وڈیرا بن کر مزارع کو ہنکارے، کوئی ایرانی بن کر افغانی کو للکارے، اور کوئی چودھری بن کر "مصلی" کو پچھاڑے، پیغمبر اسلامؐ نے مدت ہوئی غلام زادے اسامہ بن زیدؓ کو اپنی گود میں بٹھا کر آقائی و غلامی کے مصنوعی فرق کو مٹا دیا تھا، بلال حبشی کو کعبے کی چھت پر کھڑا کر کے رنگ و نسل کا بت گرا دیا تھا اور یاایھا الناس اور یا بنی آدم کہہ کر زبان و وطن کا حساب چکا دیا تھا۔

ہمارے یہ حواس باختہ "دانشور" چاہتے ہیں کہ انسانیت کے عالمی اجتماع کو صوبائی "چوپالوں" میں بدل دیں اور امت کے دریا کو علاقائیت کے حقیر ندی نالوں کا رنگ دیں، تیل سے جلنے والے چراغوں کے دور میں ہم نے براعظموں کے فاصلے طے کر لیے تھے اور آج بجلی کے قمقموں میں ہمیں دوسرے صوبے کے لوگوں سے ملنا دشوار ہو رہا

ہے اسے کہتے ہیں انقلاب معکوس!

محمد بن قاسمؒ نے سندھ پر کیسے قدم رکھا؟ یہ کسی اندھیری رات کا قصہ نہیں روشن تاریخ کا حصہ ہے، جسے ہر ذی علم پڑھ سکتا ہے، دیبل کے قریب ڈاکوں نے ایک قافلہ لوٹا اور کچھ عورتوں کو اغواء کرلیا، حجاج اپنی تمام تر سنگدلی کے باوجود ایک عورت کی فریاد پر پانی پانی ہوگیا، اپنے چچیرے بھائی محمد بن قاسمؒ کو ڈاکوؤں اور ان کے سرپرست راجہ داہر کی سرکوبی کے لیے چھ ہزار سپاہ کے ساتھ سندھ روانہ کیا، داہر نے سرکشی کا مظاہرہ کرتے ہوئے مقابلہ کیا، داہر کے مظالم سے تنگ آئی ہوئی آبادی نے اس حملے کا خیر مقدم کیا، جس کے نتیجے میں داہر کو قدم قدم پر شکست ہوئی اور محمد بن قاسمؒ سندھ کا ہیرو بن گیا، محمد بن قاسم خود تو کچھ دنوں بعد چلا گیا مگر سندھیوں کے دل بھی ساتھ لے گیا، اور آج تک وادی مہران لا الا الہ اللہ کے نعروں سے گونج رہی ہے۔

راجہ داہر کی شکست پر کسی نے سوگ نہیں منایا مگر محمد بن قاسمؒ کی جدائی پر کئی دل پھٹ گئے، راجہ داہر کے دور اقتدار میں بھی اسکی پرستش نہ ہوسکی جبکہ بعض سادہ لوح لوگوں نے محمد بن قاسم کے مجسمے تراش کر ان کی پوجا کی۔

محمد بن قاسم نے نہ تو بہ نوک شمشیر اہل سندھ کا مذہب بدلا اور نہ ہی امن پسند رعایا سے تعرض کیا، تاریخ بتاتی ہے کہ محمد بن قاسم نے داہر کو مصالحانہ انداز اپنانے کا مشورہ دیا، اور معاملے کو مخصوص ''ایشو'' تک محدود رکھنے کی تلقین کی مگر راجہ داہر کے ان الفاظ نے چنگاری کو شعلہ بنا دیا کہ ''اس کا فیصلہ تلوار کرے گی، اسلام کا مزاج یہ ہے کہ وہ اپنے فروغ اور اشاعت کے لیے تلوار کا سہارا نہیں لیتا اور نہ اپنے تغلب کے لیے خون بہانا چاہتا ہے البتہ فتنے کی سرکوبی کے لیے وہ ہر تکلف کو بالائے طاق رکھ کر اقدام کرتا ہے، اس کے نزدیک ''فتنہ'' معاشرے کی آبرو کے لیے خطرہ ہوتا ہے، راجہ داہر نے ایسی ہی فتنہ انگیزی کے اسباب پیدا کر دیئے تھے، جن کا استیصال ضروری تھا، لوگ فتنے کا شجرہ نسب ڈھونڈھنا شروع کر دیتے ہیں اسلام اس کا راستہ روکنے کی کوشش میں

لگ جاتا ہے، فتنہ اندورن ملک ہو یا بیرون ملک، وہ قلع قمع کیے جانے کے قابل ہے، اس میں ہند اور سندھ کی تمیز بے معنی چیز ہے، آج کی دنیا میں بوسنیا ہو یا کشمیر، جنوبی افریقہ ہو یا فلسطین انہی نام نہاد ''سفارتی نزاکتوں'' اور ''سرحدی تکلفات'' کی نذر ہورہا ہے اور یہ علاقے ''فتنہ'' کی زد میں ہیں، یہاں نہ انسانی لہو کی حرمت رہ گئی ہے اور نہ انسانی آبرو کی کوئی وقعت باقی ہے، اگر اسلام کے حقیقی مزاج کو سمجھا جائے تو ان فتنوں کی سرکوبی کوئی مسئلہ نہیں لیکن محمد بن قاسمؒ کہاں سے آئے جو عصر جدید کے ''داہروں'' کو سبق سکھائے۔

سندھ میں داہر کلچر کے علمبردار محمد بن قاسم کو مداخلت کار سمجھتے ہیں، اور سندھی تہذیب کو بگاڑنے والا قرار دیتے ہیں، سوال یہ ہے کہ سندھی تہذیب کیا ہے؟ جس زمانے میں محمد بن قاسم سندھ میں قدم رکھتا ہے، سندھ بت پرستی کا گڑھ تھا، اور سونے چاندی کی مورتیوں کی پوجا کا عام رواج تھا، اسکے علاوہ ہندو راجاؤں کی حکومت تھی، وہ محمد بن قاسم تھا جس کی سندھ آمد کے طفیل لوگ بت پرستی چھوڑ کر عقیدہ توحید پر آ گئے، گیتا کو خیر باد کہہ کر قرآن مجید کے قاری بن گئے، اور آج تک بیسیوں نسلیں گزرنے کے باوجود سندھیوں کو کبھی دوبارہ بت پرستی اور گیتا پڑھنے کا شوق نہیں چرایا، اس اعتبار سے دیکھا جائے تو محمد بن قاسمؒ سندھ کا محسن تھا، غاصب یا مداخلت کار نہیں تھا۔

داہر پرست غالباً یہ باور کرانا چاہتے ہیں کہ ہم سندھی ہیں اور محمد بن قاسمؒ عربی تھا، اسے کیا حق تھا کہ وہ یہاں کے معاملات میں مداخلت کرتا؟ یہ سوچ بڑی پوچ ہے، گویا ایک قوم، قبیلے، یا علاقے کا وڈیرا جو چاہے اپنے لوگوں سے سلوک کرے، انہیں جانور سمجھ کر ہانکتا پھرے، اپنا غلام بنائے رکھے، افراد قوم کی جان، مال، آبرو، کے تحفظ سے بے پروا اور غافل رہے چونکہ وہ اسی قوم اور قبیلے کا فرد ہے اس لیے اسے ہر طرح کی ''بدمعاشی'' کا سرٹیفیکٹ ملا ہوا ہے کسی دوسرے قبیلے، علاقے یا قوم کے فرد کو مظلوم کا ساتھ دینے کی اجازت نہیں یہ کیقباد و کیخسرو کے دور کا رواج تو ہوسکتا ہے، محمد عربیؐ کا

دین اس دھاندلی اور عصبیت کو برداشت نہیں کرسکتا، دین اسلام ظالم اور مظلوم کو رنگ و نسب اور علاقہ و وطن کی عینک سے نہیں دیکھتا بلکہ انسانی آبرو کے حوالے سے دیکھتا ہے، ظالم اپنا ہو تو بھی قابل مذمت اور مظلوم بیگانہ ہو تو بھی لائق معاونت!

ایک اور سوال بھی ہے کہ داہرازم کے فروغ سے حاصل کیا ہوگا؟ اس دور میں کیا روشن پہلو ہے جسے اجاگر کرنا ضروری ہے؟ اس عہد کی کیا مقدس یادگار ہے جس کا تحفظ لازمی ہے؟ اس زمانے کی کیا خوشگوار یادیں ہیں جنہیں دہرانا ناگزیر ہے؟

توہم پرستی کا ایک دور تھا سو گزر گیا، راجاؤں کا رواج تھا سو چل بسا، صنمیات کا زمانہ تھا سو رخصت ہوگیا، آج کا سندھ شاہ عبداللطیف بھٹائی کا سندھ ہے، شہباز قلندر کا سندھ ہے، سندھ انہی ناموں سے پہچانا جاتا ہے، یہ نام ہندو متھالوجی کی پیداوار نہیں، محمد بن قاسم کے پیغام توحید کا فیضان ہیں۔ یہ موحد اور مومن صوفی ہیں، جو مہران کے ماتھے کا جھومر ہیں، داہر کے دور کا وہ کون سا تعارف ہے جو سندھ کے لیے قابل فخر اور سرمایہ ناز ہو، کوئی بھی نہیں، محض سندھی عصبیت، فقط قومیتی غرور اور علاقائی تشخص کوئی اچھا تعارف نہیں ہوتا، محمد بن قاسمؒ نے سندھ کے تنگنائے کو اسلام کے سمندر کا حصہ بنا دیا تھا، ورنہ کب تک کوئی نسلی غرور کی غذا کھا کر جی سکتا ہے، نظریاتی غذا ہی قوموں کو صدیوں تک زندہ رکھتی ہے۔

اس پورے پس منظر میں ایک بات البتہ لائق توجہ ہے اور کسی قدر قابل افسوس بھی، وہ یہ کہ بنیادی طور پر محمد بن قاسمؒ ایک عورت کی فریاد پر ڈاکوؤں کا قلع قمع کرنے وارد سندھ ہوا تھا، مگر بدقسمتی سے آج سندھ دنیا بھر میں ڈاکوؤں کی کارروائیوں کے باعث شہرت پا رہا ہے، حالانکہ سندھ کے اسلامی تشخص کا آغاز ہی ڈاکوؤں اور ان کے پشتیبان راجہ داہر کے خلاف بھرپور کارروائی سے ہوا، آج انقلاب زمانہ ہے کہ وہی سندھ ڈاکوؤں کی سرگرمیوں کے عنوان سے مشتہر ہو رہا ہے۔

کہیں ایسا تو نہیں کہ داہر پرست جاگیردار اور مفاد پرست دانشور اس چہرے کو مسخ

کرنے کی سازش کر رہے ہیں جو چہرہ اسلام کے حوالے سے مہمان نواز، مہربان، وسیع الظرف اور خوش منظر چہرہ بنا، اسے بگاڑ کر یہ لوگ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ محمد بن قاسمؒ جو غازہ لگا کر گیا تھا وہ عارضی اور مصنوعی تھا، آخر وہ اتر گیا ہے، سندھ کے غیور، صوفیاء کے دلدادہ، عشق رسولؐ کے پیکر، مہر و محبت کے علمبردار ارباب تصوف، اصحاب دانش اور صاحبان درد کو اس امر پر توجہ مرکوز کرنی چاہیے، تا کہ سندھ کا محبوب، مہربان، خوشنما، نرم و ملائم، مہمان نواز، اسلام پسند، حب رسولؐ سے آراستہ، اور جاہلی تعصّبات سے پاک چہرہ نمایاں ہو سکے، اور وہ باب الاسلام ہونے کا اعزاز فی الواقع برقرار رکھ سکے۔

☆☆☆☆

فردِ فریدؒ

انوکھی وضع ہے سارے زمانے سے نرالے ہیں
یہ عاشق کون سی بستی کے یارب رہنے والے ہیں

انوکھی وضع کے یہ عاشق فی الواقع زمانے بھر سے نرالے ہوتے ہیں، عام لوگوں کے لیے جو غم دوراں ہوتا ہے یہ اس غم کو ''غم جاناں'' بنا لیتے ہیں، جو آزمائش اہل دنیا کے لیے باعث آزردگی ہوتی ہے یہ لوگ اسے ''حاصل زندگی'' قرار دیتے ہیں، دنیا والے برگ وثمر کی آرزو کرتے ہیں یہ عاشق برق وشرر کی جستجو میں رہتے ہیں، اہل زمانہ نام ونمود پہ مرے جاتے ہیں یہ انوکھی وضع والے پکارتے رہ جاتے ہیں۔

مجھے خاک میں ملا کر میری خاک بھی اڑا دے
ترے نام پہ مٹا ہوں مجھے کیا غرض نشاں سے

مگر ہوا یہ کہ نام ونمود والے نیست ونابود ہو کر رہ گئے، فتنہ گر وچالاک پیوند خاک ہو گئے، آب بقاء پینے کا دعویٰ کرنے والے کوچہءفنا میں دفن ہو گئے، اپنے نام کے خطبے پڑھوانے والوں کو کوئی فاتحہ پڑھنے والا نصیب نہ ہو سکا، شہرت کی چکاچوند میں زندگی بسر کرنے والوں کو بعد از مرگ قبر پر شمع جلانے والا نہ مل سکا، جن کی حویلیوں میں چمن آباد تھے، آج ان کی مٹی برباد ہے، جن کے ناموں پہ شہر بستے تھے ان کے مرقدوں پہ ویرانی برستی ہے، اور جن کے دم سے رونق محفل تھی دائمی گمنامی ان کی منزل ٹھہری۔

جن کی نوبت کی صدا سے گونجتے تھے آسماں

دم بخود ہیں مقبروں میں ہوں نہ ہاں کچھ بھی نہیں

لیکن جو لوگ خاک بسر رہے وہ تاریخ عالم میں امر ہو گئے، جو بے نشان رہے ان کے آستان بنے، زمانہ جن کی خاک اڑاتا رہا ان کا پھریرا چہار سو لہرا رہا ہے، جو خاک نشین تھے وہ ہمسایہ جبریل امین بن گئے، جو خانماں برباد تھے آج ان کے نگر آباد ہیں، جن کی جھونپڑی میں دیا نہیں جلتا تھا ان کی لحد سے چشمہ نور ابلتا ہے۔ جن کو دو وقت کی روٹی نہیں ملتی تھی، ایک دنیا ان کے نام پر پلتی ہے۔

جو ٹھنڈے پانی کو ترستے تھے آج ابر کرم بن کر برستے ہیں اور جو عمر بھر محروم التفات رہے آج وہی لوگ سب کا مرکز توجہات ہیں، یہی وہ انوکھی وضع والے اور سارے زمانے سے نرالے لوگ ہیں کہ دنیا شاہی دستر خوان کے ترنوالے ڈھونڈتی رہی اور یہ بھات کے پیالے پر راضی رہے، نازوں کے پالے اطلس و کمخواب کے بستر پر پہلو بدلتے رہے اور یہ فرش خاک پر گہری نیند کے مزے لوٹتے رہے، اُمراء حصول زر میں سرگرداں رہے اور یہ خرقہ فقر میں شاداں رہے، ان کا روّیہ زمانے بھر سے مختلف رہا، کانٹا کسی کو چبھتا تھا تڑپتے یہ تھے، پیاس کسی کو لگتی تھی پپڑی ان کے ہونٹوں پر جمتی تھی، بھوک کسی کو ہوتی ہُوک ان کے دل سے اٹھتی، بیمار کوئی ہوتا بے چین یہ رہتے، مبتلائے درد کوئی ہوتا آہیں ان کی نکلتیں، آگ کہیں سلگتی دھواں ان کے سینے سے اٹھتا، آنکھ کسی کی دکھتی، نیند ان کی اڑتی، گمراہ کوئی ہوتا مصروف دعا یہ ہوتے، مقدر کسی کے پھوٹتے، ضبط کے بندھن ان کے ٹوٹتے، ٹھوکر کسی کو لگتی چوٹ ان کے دل پر پڑتی، آہ سرد کسی کی ابھرتی نبض ان کی ڈوبنے لگتی۔

جو لوگ دھکے دیتے یہ انہیں سینے سے لگاتے تھے، جو انہیں نشانہ ملامت بناتے یہ انہیں اپنے پاس بٹھاتے تھے، جو انہیں بد دعائیں دیتے یہ ان کی بلائیں لیتے تھے، جو انہیں شہر سے نکالنے کے منصوبے بناتے یہ انہیں دل میں جگہ دیتے تھے، جو انکی شہرت بگاڑتے تھے یہ ان کی قسمت سنوارتے تھے، جو انہیں نشانہ ستم بناتے یہ ان کے لیے نمونہ

کرم بنتے، جو انہیں برا کہتے یہ ان کا بھلا چاہتے تھے، جو ان سے بگڑتے تھے یہ ان سے جڑتے تھے یہ لوگ بھی عجیب تھے خدمت مخلوق کی کرتے تھے اجرت خالق سے مانگتے تھے، رہتے دنیا میں تھے فکر عقبیٰ کی کرتے تھے، قدم فرش پر جماتے تھے، خبر عرش کی لاتے تھے، مزاج قلندرانہ تھا، دماغ سکندرانہ رکھتے تھے، گوشہ دامان میں زمین و آسمان کی وسعتیں تھیں۔

ٹاٹ کی گدڑی میں درویش نگری اور گھاس پھونس کی کٹیا میں فقر کی دنیا آباد تھی تاج شاہی کی سج دھج غارت ہوگئی مگر ان کی دو پلی ٹوپی کی شان سلامت رہی۔

حضرت بابا فرید الدین گنج شکرؒ بھی ایک ایسے ہی انوکھی وضع والے اور سارے زمانے سے نرالے تھے، دنیا پایہ تخت دہلی کی رونقیں سمیٹ رہی تھی یہ بندہ خدا فریضہ دعوت کی ادائیگی کے لیے وہاں سے اپنا بوریا بستر لپیٹ رہا تھا، لوگوں کا رخ دہلی کے دربار کی طرف تھا ان کا خیال پاک پتن کے اجاڑ کی طرف تھا، دہلی تو پہلے ہی ایک شاداب چمن تھا اصل مسئلہ پاک پتن کے صحرا کو گلشن میں بدلنے کا تھا، دہلی پایہ سلطنت تھا، وہاں مہ رخوں کا ہجوم تھا، اجلے چہروں اور اونچے لوگوں کی بہتات تھی، گرمی بازار عروج پر تھی، رونق انجمن زوروں پر تھی، قصر وایوان بُقعہ نور تھے گلی کوچے رشک فردوس بنے ہوئے تھے، مدرسے، مکتب، درسگاہیں، ادبی ہنگامے، شعری ہمہمے، علمی مشغلے، سیاسی غلغلے، حصول جاہ کے ولولے گویا ایک جہان رنگ و بو آباد تھا۔

دلی کہ ایک شہر تھا عالم میں انتخاب

یہ جس نے بھی کہا صد فی صد سچ کہا، جو شکل بھی نظر پڑتی خوبصورت تصویر دکھائی دیتی، اور ادھر اجودھن یعنی پاک پتن ایک ویرانہ تھا، دہلی کی ہر صبح روشن اور ہر شام درخشاں تھی، یہاں کی صبح بے نشاں اور شام اداس و ویراں ہوتی تھی، وہاں شاہی جلسے اور یہاں درندوں کے حملے! وہاں کا ہر شخص بانکا اور سجیلا، یہاں کا ہر باشندہ بدمزاج اور ہٹیلا، وہاں اہل علم و دانش آباد تھے اور یہاں کے باسی بدمزاج اور ضعیف الاعتقاد تھے،

وہاں ہر آسائش اور سہولت اور یہاں فاقہ، تنگدستی، غربت اور عسرت۔

اہل اللہ چونکہ انوکھی وضع رکھتے ہیں، وہ آباد شہروں کی بجائے ویران دلوں کے پاس رہنے کو ترجیح دیتے ہیں، وہ پر ہجوم بازار کی بجائے اجڑے دیار کو اپنا مسکن بناتے ہیں، وہ باادب باملاحظہ ہوشیار کی صداؤں سے رغبت نہیں رکھتے وہ رندان قدح خوار کی صحبت پسند کرتے ہیں، انہیں جہان مرغ و ماہی سے اُنس نہیں ہوتا، آہ سحر گاہی میں لطف آتا ہے، وہ خسروانہ عنایات پا کر خوش نہیں ہوتے، فقیروں کی مدارات کر کے مطمئن ہوتے ہیں۔

ڈھونڈ اجڑے ہوئے لوگوں میں وفا کے موتی
یہ خزانے تجھے ممکن ہے خرابوں میں ملیں

بابا فریدؒ کبھی ''شیخ الاسلام'' نہیں رہے البتہ ان جیسا مبلغ اسلام صدیوں میں کوئی اٹھے گا، آج علماء کا سارا زور فتویٰ پر ہے صوفیاء کی نگاہ تقویٰ پر رہتی تھی۔

منبر و محراب آج بھی ہیں، لیکن بابا فریدؒ جیسا خطیب و امام کوئی نہیں، آج کے خطیب شعلے اگلتے ہیں بابا فریدؒ کے منہ سے پھول جھڑتے تھے۔

بابا فریدؒ جیسے لوگوں نے پتھر کھا کر کافروں کو مسلمان بنایا تھا اور ہم حلوہ کھا کر مسلمانوں کو کافر بنانے میں مصروف ہیں، پروفیسر آرنلڈ نے اپنی شہرہ آفاق کتاب "The Preaching of Islam" (دعوتِ اسلام) میں لکھا ہے کہ ''پنجاب میں سولہ اکھڑ اور بدمزاج قومیں بابا صاحب کے ہاتھ پر مسلمان ہوئیں''

یہی پاک پتن تھا جہاں دن کے وقت بھی گرد و پیش میں درندوں کے غول نظر آتے، بابا فریدؒ کے آتے ہی یہ خطہ پاک پتن، گہوارہ امن بن گیا، مخلوق خدا تھی کہ اُمڈی چلی آرہی تھی، کیا ہندو اور کیا مسلمان! وہ باباؒ کی دید کا ارمان دل میں لیے پھرتا تھا، ایک وقت وہ آیا کہ دہلی کی رونقیں اس قصبے کے سامنے ماند پڑ گئیں، بابا صاحبؒ کی خانقاہ میں خراسان، جرجان، دہلی، اوچ، ناگور، ملتان، اجمیر، بہار کے لوگ ہزاروں کی تعداد

میں نظر آتے، خواجہ نظام الدین دہلویؒ فرماتے ہیں کہ آپ کی خانقاہ پر آدھی رات تک قافلے اپنا رخت سفر کھولتے دکھائی دیتے، بڑے بڑے صوفیاء اجل علماء، دانشور، فوجی، وزراء، امراء، تاجر اور شہری و دیہاتی ہر طرح کے لوگوں کا اژدہام ہوتا، اس بے آب و گیاہ خطے میں دور دراز علاقے میں پروانوں کا اتنا زیادہ ہجوم کیوں ہوتا تھا؟ صرف اس لیے کہ ایک مرد خلیق نے شمع محبت جلا رکھی تھی، طریق تبلیغ ایسا تھا کہ وحشی بھی دل ہار بیٹھتے کسی مرید نے ایک قینچی آپ کی نذر کی آپ نے فرمایا۔

"مجھے سوئی چاہیے قینچی نہیں میں گانٹھنے کا کام کرتا ہوں کاٹنے کا نہیں"

پیلو اور ڈیلے کھا کر گزارہ کرنے والا یہ مرد قلندر نذرات وفتوح بے نیاز ایک ہی دھن میں رہتا کہ اسے کسی طرح اپنے مالک و خالق کا قرب اور خوشنودی حاصل ہو جائے، ان کے دل بسمل سے صرف ایک ہی ہُوک اٹھتی اور وہ لفظوں کے قالب میں ڈھلتی۔

"میں صرف اتنا کہہ سکتا ہوں کہ مجھے تجھ سے محبت ہے تو میری راتوں اور دن میں خواب بن کر آتا ہے یہی میرے دل کی پکار ہے اور یہی میری نمازوں کا ماحصل! میں صرف اتنا کہتا ہوں مجھے تجھ سے محبت ہے"

بابا فریدؒ کبھی حجرے میں اکیلے ہوتے تو گھنٹوں زمین پر سر رکھ کر کہتے رہے۔

از بہر تو میرم وز برائے تو زیم

(میں تیرے لیے زندہ ہوں اور تیرے لیے مرتا ہوں)

ان کا سب کچھ اللہ کے لیے تھا، رنج، خوشی، غصہ، پیار، یگانگت، بیگانگی، دوستی، دشمنی، لینا، دینا، تبسم، آنسو، سوچ، خیال، فکر، درد، آہ، سوز، گریہ، راحت، کلفت، اوڑھنا، بچھونا، جینا، مرنا ان سب کا پیمانہ اور معیار سارے جہانوں پر پروردگار تھا۔

کسی نے آپ سے زکواۃ کا مسئلہ پوچھا، آپ نے فرمایا:

"زکواۃ کی تین قسمیں ہیں، زکواۃ شریعت، زکواۃ طریقت، زکواۃ حقیقت! زکواۃ

شریعت یہ ہے کہ آدمی دو سو درہم میں سے پانچ درہم دے دے، زکواۃ طریقت یہ ہے کہ پانچ رکھ لے اور باقی نکال دے، اور زکواۃ حقیقت یہ ہے کہ سب کچھ دے دے اور اس کے پاس کچھ نہ رہے"

ان صلواتی و نسکی محیای و مماتی للہ رب العالمین

اس خود سپردگی کا نتیجہ تھا کہ بابا صاحبؒ کو ایک مرحلے میں کہنا پڑا۔

"چالیس برس تک میں نے وہ کیا جو میرے رب نے چاہا اب میں جو چاہتا ہوں میرا رب اسی طرح کر دیتا ہے"

بابا فریدؒ نے عمر بھر اپنا بستر اس کی گلی میں لگایا جس کی پھیری لگانے والوں میں دارا و سکندر اور خاقان و کیخسرو جیسے شہنشاہ شامل ہیں، آپ نے نہ کبھی غیر کے سامنے دامن پھیلایا اور نہ دست سوال دراز کیا، شاہان وقت کو ضرورت پڑی تو جھونپڑی کا طواف کر گئے، مگر آپ نے کسی قصر مرمر کی طرف نگاہ غلط بھی نہیں ڈالی۔

تیمور نے پورا برصغیر روند ڈالا، لیکن جب اجودھن سے گزرا تو تلوار نیام میں ڈال لی اور بڑے احترام سے باباؒ کے مزار پر حاضری دی، اسے اندازہ تھا کہ اس نے تیغ و تفنگ سے دنیا تہہ و بالا کی ہے مگر باباؒ نے اپنے خوبصورت آہنگ سے دلوں کو اجالا ہے۔

سلطان غیاث الدین بلبن آپ کے ارادت مندوں میں تھا، مگر کیا مجال کہ بابا فریدؒ نے کبھی اس سے تعلق بڑھایا ہو، اس لیے کہ اس دن فقیر کی روحانی موت واقع ہو جاتی ہے جب وہ کبھی امیر کے دربار میں حاضری بھرتا ہے، ایک بار کسی پیارے مرید کے اصرار پر آپ نے ایک سفارشی رقعہ لکھا مگر وہ رقعہ کیا تھا بے نیازی کا مرقع تھا، آپ نے لکھا۔

"میں نے اس کا معاملہ پہلے اللہ تعالیٰ بعد ازاں تمھارے سپرد کیا، اگر تم کچھ کر دو گے تو یہ دراصل عطیۂ خداوندی ہو گا اور اس کا تمھیں اجر ملے گا، اگر کچھ نہ کر سکو تو دراصل روکنے والا اللہ تعالیٰ ہے اور تم اس معاملہ میں معذور ہو گے۔"

برصغیر میں سلسلہ چشتیہ کو سب سے زیادہ فروغ اور استحکام آپ کے توسط سے نصیب ہوا، آپ ہی کا فیض ہے جو پورے پنجاب میں پانچ دریاؤں کی طرح جاری ہے، کوٹ مٹھن کے خواجہ فریدؒ سے لے کر گولڑہ شریف کے پیر مہر علیؒ تک سبھی اس در کے گدا ہیں، قبلہ عالمؒ کو بھی اسی در سے نسبت حاصل ہے۔ پیر پٹھانؒ کا مان بھی آپ کے دم سے ہے، پیر سیالؒ کو بھی آپ نے نہال کیا، ملتان کے حافظ جمالؒ کا سارا کمال بھی آپ کے صدقہ ہے، نارووالہؒ کے لیے بھی آپ ہی کی ذات معتبر حوالہ ہے۔

آپ کے خلفاء میں شیخ جمال الدین ہانسویؒ ایک بہت بڑا نام ہے، حضرت شیخ بہاؤ الدین زکریا ملتانیؒ نے تو ایک بار منہ بھر کر کہہ دیا تھا کہ بابا صاحبؒ مجھ سے میرے سارے مرید لے لیں ایک جمالؒ مجھے عنائت کر دیں آپ نے پلٹ کر فریاما۔

''مال کا تبادلہ تو دنیا میں ہوتا ہے جمالؒ کا تبادلہ کیسے ہو''؟

ایک اور ممتاز اور بڑا نام حضرت خواجہ نظام الدین دہلویؒ کا ہے، جو دہلی میں آسودہ خاک ہیں، واقعہ یہ ہے کہ دہلی ہو یا لاہور، ان کا وقار و اعتبار کجکلاہوں سے نہیں ان بے نواؤں سے ہے، لاہور میں سلطان قطب الدین ایبک دفن ہے، شہنشاہ جہانگیر کا مقبرہ ہے لیکن دونوں نے کسی اور اجنبیت کی تصویر! دہلی میں خاندان مغلیہ کا سپوت سلطان نصیر الدین ہمایوں سپرد خاک ہے، لیکن چپ چاپ اور الگ تھلگ! ایک پاک پتن ہے شہروں سے الگ تھلگ، چھوٹا اور گمنام شہر، مگر ایک فقیر کے قدم کیا لگے ہیں اس کو بھاگ لگ گئے ہیں، بہادر شاہ ظفر ایک پھول کو ترس گیا تھا یہاں گلشن آباد ہیں، وہ ایک چراغ کو ترستا رہا یہاں رات دن چراغاں ہے، اسے افسوس رہا کہ کوئی پئے فاتحہ نہیں آتا اور یہاں زائرین کا جمگھٹا ہے، اقبالؒ نے سچ کہا ہے۔

نہ تخت و تاج میں نے لشکر و سپاہ میں ہے
جو بات مرد قلندر کی بارگاہ میں ہے

☆☆☆☆

گردن نہ جھکی جس کی جہانگیر کے آگے

قدیم ترین اور انتہائی زرخیز تہذیبوں کا گہوارہ خطہ ہند اپنی خاک کے اٹھنے اور آغوش میں پرورش پانے والے اپنے دو عظیم فرزندوں پر جتنا بھی فخر کرے بہت کم ہے، ان میں ایک شیخ احمد سرہندیؒ ہیں جنہیں ایک دنیا مجدد الف ثانی کے عظیم الشان اور باوقار لقب سے یاد کرتی ہے اور دوسرے حضرت شاہ ولی اللہ ہیں، جنہیں سرزمین ہند پر ''آیات اللہ'' میں سے ایک ''آیت'' کہا جائے تو مبالغے کا ذرا بھی تاثر نہیں ابھرتا۔

خطہء ہند میں بڑی بڑی پرشکوہ سلطنتیں قائم ہوئیں، اور جاہ و جلال اور شوکت و سطوت کے شاندار اور گہرے نقوش چھوڑے، فاتحین اور سلاطین کی یہ سرزمین کئی اعتبارات سے بہت نامور اور ممتاز ہے، اس کی تہذیب بہت قدیم ہے اور اس کے امتیازات تاریخ کی کتابوں میں بڑے جلہ عنوانات سے درج ہیں، اسی سرزمین پر شہاب الدین غوری اترا اور غوری خاندان کی حکومت قائم ہوئی، یہ خطہ محمود غزنوی کی دیوان گاہ بھی رہا یہاں علاء الدین خلجی اور غیاث الدین بلبن جیسے افسانوی ہیبت و عظمت رکھنے والے لوگ بادشاہ رہے۔ سلطان محمد تغلق کا سکہ بھی یہاں چلا قطب الدین ایبک، شمس الدین التمش اور رضیہ سلطانہ کے ذریعے ''خاندان غلاماں'' کی حکومت رہی، ظہیر الدین بابر نے سلطنت مغلیہ کی بنیاد رکھی، 1519ء سے 1857ء تک تقریباً تین سو سال مغلوں نے حکومت کی، نصیر الدین ہمایوں، جلال الدین اکبر، جہانگیر، شاہجہاں، اور اورنگزیب عالمگیر جیسے سلاطین مغل سلطنت کے بڑے معتبر حوالے

ہیں۔

ممالک ہند کی شاہی تاریخ میں یہ مغلیہ دور سب سے زیادہ طویل، اور وسیع و عریض تھا، بیس کروڑ انسان دہلی کی رعایا تھے اور یہ رقبہ پندرہ لاکھ مربع میل کابل سے راس کماری تک اس سلطنت کا پھیلاؤ تھا، بایں ہمہ ان میں سے کچھ بھی نہ ہوتا، یہ سلطنتیں ہوتیں اور نہ سلاطین ہوتے پھر بھی خطۂ ہند کی عظمت شہرت، سطوت، شوکت اور عزت کے لیے اتنا ہی کافی ہے کہ مجدد الف ثانیؒ اور شاہ ولی اللہ اسی خطہ میں پیدا ہوئے۔ حضرت مجدد الف ثانی 971ء ہجری میں پیدا ہوئے اور 1034 ہجری میں دنیا سے رخصت ہوئے، بچپن اور لڑکپن کے ابتدائی تیرہ سال نکال دیئے جائیں تو باقی پچاس سال کا ایک ایک لمحہ اس امر کی گواہی دیتا ہے کہ:

حاصل عمر نثار رہ یارے کردم
شادم از زندگی خویش کہ کارے کردم

آپ نے تریسٹھ برس عمر پائی، اور اس عمر کو حصول علم، منازل سلوک، وعظ و تبلیغ، تصنیف و تالیف اور سیاسی جدوجہد میں صرف کیا، راحت ولذت، عشرت و عافیت اور منصب و منفعت کا کوئی مرحلہ آپ کی زندگی میں نظر نہیں آتا، آپ کا اسلوب عالمانہ مزاج صوفیانہ اور انداز مجاہدانہ رہا۔

ظاہر ہے جس شخص کے ہم سقب ملا عبدالحکیم سیالکوٹی، رہے ہوں اس کے اطوار عالمانہ ہوں گے، جس کے والد گرامی کو شیخ عبدالقدوس گنگوہی سے بیعت کی نسبت حاصل ہو اس کا مزاج صوفیانہ بنے گا، اور جس کا سلسلہ نسب ستائیس پشتوں سے حضرت عمر بن خطابؓ سے ملتا ہو اس کا کردار یقیناً مجاہدانہ ہوگا۔

شیخ مجدّد کی یہ خوش بختی ہے کہ انہیں حضرت باقی اللہ جیسے صالح اور راست فکر بزرگ کی صحبت نصیب ہوئی اور ان سے خصوصی تربیت حاصل کی، شیخ مجدد کی فطری اٹھان کچھ اس طرح کی تھی کہ تھوڑے ہی دنوں میں حضرت شیخ باقی باللہ نے آپ کے

اندروہ جوہر ڈھونڈ لیا جس کی آب وتاب سے ظلمت کدہ ہند چمکنے والا تھا، اپنے ایک دوست کو شیخ باقی لکھتے ہیں۔

''حال ہی میں سرہند سے ایک شخص شیخ احمد باقی آیا ہے، نہایت ذی علم ہے بڑی علمی طاقت رکھتا ہے چند روز فقیر کے ساتھ اس کی نشت وبرہ ہوئی ہے، اس دوران میں اس کے حالات کا جو مشاہدہ ہوا، اس کی بنیاد پر توقع ہے کہ آگے چل کر یہ ایک چراغ ہو گا جو دنیا کو روشن کردے گا''

شیخ باقی باللہ کی یہ توقع لفظی و معنوی دونوں اعتبار سے درست ثابت ہوئی اور شیخ مجددؒ طاقچہ سرہند میں روشن چراغ نہیں بلکہ آسمان ہند پر آفتاب بن کر چمکے۔

حضرت مجددؒ کے علمی روحانی اصلاحی اور تجدیدی کارناموں کے کئی پہلو ہیں، تین باتیں آپ کو نہ صرف اپنے معاصر سے ممتاز کرتیں بلکہ آنے والے وقتوں میں بھی ایک معزز اور باوقار مقام دیتی ہیں۔

اولاً۔ دین کے بے آمیز تعلیم اور رائج الوقت بدعات وخرافات پر شدید تنقید،

ثانیاً۔ تصوف کی دنیا میں در آنے والی شعبدہ بازیوں اور نکتہ طرازیوں کی تردید اور صوفی کے صحیح کردار کی وضاحت،

ثالثاً۔ معاصر سیاسی اور دینی فتنوں کی بروقت اور حوصلہ مندانہ سرکوبی۔

جس عہد میں آپ نے کام کا آغاز کیا اس وقت ہندوستان اعتقادی اعتبار سے عجیب وغریب نمونہ پیش کر رہا تھا، ہندو مذہب وتہذیب کے زیر اثر مشرکیہ اعمال و افعال بھی زوروں پر تھے، اوقام وخرافات کا دھندا بھی عروج پر تھا، اور نوابی رسموں کا بازار بھی گرم تھا، حضرت مجدد نے اپنی دعوت کا مرکز ''توحید'' کو بنایا، ان کے مکتوبات کا اکثر حصہ توحید کی تشریح تفصیل، اور تفہیم کے لیے وقف نظر آتا ہے، ویدانت، تناسخ اور وجودی فلسفوں کا شیخ نے تار و پود بکھیر کر رکھ دیا، ''شریعت'' کو ''پوست'' اور ''طریقیت'' کو ''مغز'' کہنے والوں کی آپ نے خوب خبر لی، مکتوبات جلد اول کے

چالیسوں خط کے مندرجات کچھ اس طرح ہیں۔

''شریعت کے تین جز ہیں، علم، عمل، اور اخلاص پس طریقیت و حقیقت دونوں شریعت کے تیسرے جزو یعنی اخلاص کی تکمیل کے لیے شریعت کے خادم ہیں، اکثر لوگوں نے خواب و خیال میں اپنے آپ کو بسا رکھا ہے اور لاطینی باتوں پر کفائت کی ہوئی ہے، یہ لوگ شریعت کے کمالات کیا جانیں اور حقیقت طریقت کو کیا سمجھیں؟ شریعت کو پوست خیال کئے ہوئے ہیں اور حقیقت کو مغز نہیں جانتے کہ اصل معاملہ کیا ہے؟

مکتوبات امام ربانی کی جلد اول میں ایک اور مکتوب گرامی ہے جس کا نمبر شمار 48 ہے فرماتے ہیں ''کل قیامت کے روز شریعت کی بابت پوچھا جائے گا نہ کہ تصوف کے بارے میں، جنت میں داخل ہونا اور دوزخ سے بچنا شریعت کے احکام کی بجا آوری پر منحصر ہے انبیاء علیہ السلام جو خیر الخلائق ہیں نے شرائع کی دعوت دی ہے اور نجات کے لیے شریعت ہی کو مدار قرار دیا ہے، ان کی بعثت کا مقصد شریعت کی تبلیغ ہے بڑی سے بڑی نیکی یہ ہے کہ شریعت کو رواج دینے اور اس کے احکام میں سے کسی حکم کو زندہ کرنے کی کوشش کی جائے خاص کر ایسے زمانے میں کہ اسلام کے نشانات مٹ گئے ہوں کروڑوں روپیہ خدا کی راہ میں خرچ کرنا اس کے برابر نہیں کہ کسی شرعی مسئلہ کو رواج دیا جائے''

حضرت شیخ نے ہر نوع کی ''خانہ ساز شریعت'' اور اس کے پردے میں ہونے والی خرافات کو اپنی قلمی مکتوبات اور زبانی ملفوظات کے ذریعے کتاب و سنت کی روشنی میں رد کر دیا اور دین اسلام کا رخ روشن اس کی بے آمیز تعلیمات کے آئینے میں واضح کر دیا۔

اسی طرح آپ نے ان لوگوں کا بڑھ چڑھ کر اور کامیاب تعاقب کیا جنہوں نے پیری مریدی کو ایک کاروبار بنا رکھا تھا اور صوفیا نے اصلاحات کو جال بنا کر لوگوں کو

پھنسانے کا دھندا اپنا رکھا تھا، آپ کے دور میں اور آج بھی "ہفت رنگ پیر" مل جاتے ہیں جو سیدھے سبھاؤ الف ب تو پڑھ نہیں سکتے لیکن خود کو "علم لدنی" کا حامل سمجھتے ہیں، صحیح تلفظ کے ساتھ قرآن مجید کی ایک آیت پڑھنے کے قابل نہیں لیکن اپنے آپ کو "واقف اسرار و رموز" گردانتے ہیں، نماز کے ارکان کی خبر نہیں اور اگلے جہان کی خبریں سناتے ہیں، ایک حدیث رسولؐ کا متن یاد نہیں لیکن "لوح محفوظ" کا اپنے آپ کو عالم بتاتے ہیں، اپنا گزارہ مریدوں کی نذر و نیاز پر ہوتا ہے لیکن کون و مکان کے کنجی بردار ہونے کا دعویٰ رکھتے ہیں، حضرت شیخ نے ان نام نہاد دعویداروں سے خوب مقابلہ کیا اور ہر بات کو شریعت کی کسوٹی پر پرکھنے کا طریقہ واضح فرمایا اور فرمایا کہ "اس کے علاوہ جو کچھ ہے وہ زندقہ ہے نفس پروری ہے حیلہ گری ہے، اور خودسری ہے" حکیم الامت علامہ اقبالؒ نے "بال جبریل" میں "پنجاب کے پیرزادوں سے" کے عنوان سے جو نظم لکھی ہے، اور حضرت مجدد الف ثانیؒ کے حوالے سے لکھی ہے وہ شیخ کی شخصیت مزاج خدمات اور تعلیمات کا خوبصورت عکس ہے چند اشعار میں حضرت مجددؒ کی پوری شخصیت کو علامہ نے بڑے حسن کارانہ انداز سے سمو دیا ہے۔

حاضر ہوا میں شیخ مجدّد کی لحد پر
وہ خاک کہ ہے کہ زیر فلک مطلع انوار
اس خاک کے ذرّوں سے ہیں شرمندہ ستارے
اس خاک میں پوشیدہ ہے وہ صاحب اسرار
گردن نہ جھکی جس کی جہانگیر کے آگے
جس کے نفس گرم سے ہے گرمئی احرار
وہ ہند میں سرمایہ ملت کا نگہبان
اللہ نے بہ وقت کیا جس کو خبردار
کی عرض یہ میں نے کہ عطا فقر ہو مجھ کو

آنکھیں میری بینا ہیں و لیکن نہیں بیدار
آئی یہ صدا سلسلہ فقر ہوا بند
ہیں اہل نظر کشور پنجاب سے بیزار
اقبال کا ٹھکانہ نہیں وہ خطہ کہ جس میں
پیدا کلمہ فقر سے ہو بجرہ دستار

حضرت شیخ بلا شبہ مسند طریقت کے شیخ کامل، منبر رسولؐ کے سچے وارث، میدان دعوت کے کامیاب مبلغ، علوم شرعیہ کے صحیح وارث، اور سب سے بڑھ کر یہ کہ معرکہ حق و باطل کے حوصلہ مند مجاہد تھے، جس یادگار معرکے اور تجدیدی کارنامے نے آپ کی شخصیت کو لافانی اور آپ کے کردار کو مثالی بنایا ہے وہ ہے اکبر و جہانگیر کی ''جھوٹی کبریائی'' کا طلسم توڑنا اور ''فانی جہانبانی'' کا سر پھوڑنا اور نگ زیب عالمگیر نے اپنے دور میں جس طرح دین و شریعت کی پاسداری کی اور احکام کتاب و سنت کو ملک میں رائج کیا وہ آپ کی تعلیمات کی اثر آمیزی تھی، جس نے ایک پوری سلطنت اور سلطان وقت کو اپنے محیط میں لے لیا، آپ نے خانقاہ کی رونق بڑھائی لیکن وقت آنے پر رسم شمشیری ادا کرتے ہوئے خانقاہ سے نکل کھڑے ہوئے، آپ برسوں محراب و منبر کی زینت رہے لیکن کلمہ حق کہنے کی پاداش میں قلعہ گوالیار کی تنہائیوں سے بھی دوستی کی، آپ کی صدائے حق سے صرف کوچہ و بازار ہی آشنا نہیں تھے۔ شاہی دربار میں بھی اس کی گونج سنائی دی، جب شہزادہ خرم (جو بعد میں شاہ جہاں کہلوایا) نے آپ سے کہا ''سجدہ تعظیمی کی کوئی ایسی راہ نکالیئے آپ پر بھی حرف نہ آئے اور میرے والد شہنشاہ جہانگیر کی انا بھی نہ ٹوٹے''

آپ نے جواب میں فرمایا ''شہزادہ معظم اگر اللہ والے بھی سر جھکا کر چلنا شروع کر دیں تو سر اٹھا کر چلنے والا کون رہے گا؟''

شیخ مجدّد کے دور کا سب سے بڑا فتنہ ''دین الٰہی'' تھا جس کے بیک وقت دین و

سیاست دونوں پر اثرات مرتب ہو رہے تھے مکروہ اور مہلک اثرات ملا عبد اللہ اور ملا عبدالغنی جیسے لوگوں کے بے مقصد مناظروں نے اکبر کو دین کے بارے میں شکوک و شبہات میں مبتلا کر دیا، رہی سہی کسر ابو الفضل اور فیضی جیسے درباری دانشوروں نے پوری کر دی، پھر کیا ہوا ایک پورا نیا دین تصنیف ہو گیا۔ جس کے عقائد اسلام سے مختلف، جس کی شریعت اسلام سے الگ، جس کے حلال وحرام کے ضابطے اسلام سے جدا اور جس کی تمام رسوم اسلام سے متضاد۔ فریضہ حج ساقط کر دیا گیا، گائے کو ذبح ممنوع قرار دیا گیا، اکبر کو مجتہد اور امام کا درجہ دیا گیا، قشقہ لگانا، اور زنار پہننا لازمی ہو گیا، غسل جنابت موقوف، اذان اور نماز ممنوع، سود، جوا اور شراب حلال اور نکاح و طلاق کے تمام اسلامی ضابطے متروک ہو گئے اور بادشاہ کے لیے سجدہ لازم ہو گیا، الغرض ایک نئی شریعت ایک نئی تہذیب اور ایک نئی دنیا وجود میں آ گئی۔ قریب تھا کہ اس طوفان میں سے کچھ بہہ جاتا، اللہ نے شیخ مجدؒد کو ایک پہاڑ کی طرح اس طوفان کے سامنے کھڑا کر دیا اور اس کا رخ موڑ دیا اکبر کو تو توبہ کی توفیق نہ ملی مگر جہانگیر بالآخر راہ راست پر آ گیا اور اپنے باپ اکبر کے ''دین الٰہی'' کی تمام خرافات موقوف کر دیں، اور آگے چل کر اورنگ زیب کے دور میں تو پورے کا پورا نقشہ بدل گیا، اور اکبر جیسے ''ہادم شریعت'' کا پڑپوتا ''خادم شریعت'' کے طور پر مشہور ہوا۔ سچ یہ ہے کہ جو مسند دعوت پر بیٹھنا چاہتا ہے وہ شیخ مجددؒ کے مکتوبات کو حفظ کر لے اور جو میدان عزیمت میں اترنا چاہتا ہے وہ آپ کی شخصیت کو سامنے رکھ لے تو اس کے لیے اگلی منزلیں آسان ہو جائیں گی۔

''سر بجیب صوفیاء'' کی ہر دور میں کثرت رہی ہے، اب زمانہ ''سر بکف صوفیاء کی راہ دیکھ رہے ہیں، شیخ مجدؒد کی روح بھی اسی انتظار میں ہے۔

☆☆☆☆

شاہ ولی اللہؒ ۔۔۔ نابغۂ عصر

برصغیر پاک و ہند میں مسلمانوں کی ملی عظمت و شوکت کے بے شمار آثار موجود ہیں، مسلمانوں نے یہاں ایک ہزار برس تک حکومت کی، غوریوں سے لے کر مغلوں تک کئی خانوادے برسر اقتدار آئے، غوری، غزنوی، لودھی، خاندان غلاماں، سوری، اور مغل سبھی شکوہ امت مسلمہ کی یادگاریں ہیں، قدم قدم پر مسلمانوں کی قومی و سیاسی سطوت کی نشانیاں موجود ہیں، یہ سب کچھ ہمارے لیے باعث اعزاز اور سرمایہ افتخار ہے۔

فرض کیا کسی وجہ سے یہاں یہ حکومتیں قائم نہ ہوتیں، محمود غزنوی بادشاہ نہ بنتا، سکندر لودھی کی رسم تاج پوشی ادا نہ ہوتی، جلال الدین اکبر کو "مغل اعظم" جیسا پُرشکوہ خطاب نہ ملتا، غیاث الدین بلبن جیسا باجبروت حکمران اس علاقے کی باگ ڈور نہ سنبھالتا، اورنگزیب عالمگیر مغلیہ خاندان میں پیدا نہ ہوتا اور علاؤ الدین خلجی متحدہ ہندوستان کا فرمانروا نہ ہوتا یہ شاہی خانوادے سرے سے ناپید ہوتے اور مسلمانوں کو سیاسی اقتدار نصیب نہ ہوتا یہ سب کچھ نہ ہونے کے باوجود صرف ایک شاہ ولی اللہ پورے اسلامیان ہند کے لیے سرمایہ فخر اور مینارہ عظمت قرار دیے جانے کے لائق ہیں اور اسلامیان ہند کے شان و شکوہ کے لیے یہی دلیل کافی ہے کہ اس خطے میں شاہ ولی اللہ نے جنم لیا ہے۔

اسلامیان ہند کو ان کے وجود کا احساس دلانے، ان کو اپنے عقیدے پر قائم

رکھنے، ان کے اندر ملی شعور ابھارنے، اپنی جڑوں سے پیوستہ رہنے، اپنی بقا کی فکر کرنے اور عظمت رفتہ کی بازیافت کی تحریک دینے میں شاہان وقت کے مقابلے میں اکیلے شاہ ولی اللہ کا حصہ بہت زیادہ ہے، برصغیر کی بارہ سو سالہ مسلم تاریخ میں یہاں بڑے نامور لوگ پیدا ہوئے، مورخ، دانشور، صوفی، فقیہ، شاعر، محدّث، سیاستدان اور ادیب، اس اعتبار سے یہاں کی تاریخ ماشاء اللہ متمول اور شاندار ہے مگر جو جامعیت حضرت شاہ ولی اللہؒ کو قدرت کی طرف سے ودیعت ہوئی ہے وہ صرف ان کا حصّہ ہے۔

شاہ صاحبؒ ایک صاحب اسلوب مصنف، محقق، صوفی، محدث، ماہر اجتماعیات، مترجم، مفسر، فقیہ، مورخ ہونے کے ساتھ ساتھ ایک علمی سیاستدان اور مجاہد اور مرد میدان کے طور پر بھی بہت نمایاں حیثیت اور نام کے مالک اور حامل ہیں۔

یہاں ہمیں حضرت شاہ ولی اللہؒ کی شخصیت کا استثناء اور منفرد پہلو نظر آتا ہے، کہ انہوں نے اپنے علم کو سوز دماغ تک محدود نہیں رکھا بلکہ اسے سوز جگر میں منتقل کر دیا۔

ان کی کوئی تصنیف محض جودت طبع اور تعیش ذہنی کی آئینہ دار نہیں بلکہ ہر تصنیف میں انقلابی افکار نمایاں ہیں اور ملی کردار کا رنگ جھلکتا ہے، ان کی تحقیق فقط واقعات کی چھان پھٹک نہیں بلکہ اس میں امت کے ماضی مرحوم کے تجزیے اور روشن مستقبل کی جھلک ملتی ہے، ان کا تصوف اپنی ذات کے فنا اور انکار سے نہیں ملت اسلامیہ کی بقاء اور اجتماعی کردار سے عبارت ہے، ان کا درس حدیث محض متون و اسناد تک محدود نہیں ہوتا تھا بلکہ سامعین میں روح جہاد بیدار کرتا تھا، وہ قرآن حکیم کے بہترین مترجم تھے، لیکن لفظی ترجمے کے ساتھ ساتھ وہ قرآن کی حکمت و معنی کے کامیاب ترجمان تھے، انہوں نے تفسیری کام بھی کیا، اصول تفسیر بھی بیان کئے، "الفوز الکبیر" اصول تفسیر کے حوالے سے ان کا علمی شاہکار ہے، لیکن ان کا علم تفسیر لذت تقریر سے عبارت نہیں بلکہ سیاست مدن اور منزل کی تدبیر سے منسلک دکھائی دیتا ہے۔

وہ مورخ تو تھے لیکن "ازالۃ الخفاء" پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ وہ محض تاریخی

واقعات جوڑنے کے قائل نہیں تھے، بلکہ تاریخ کی کروٹوں کا جائزہ لے کر امت کو جھنجھوڑنے پر مائل تھے، ان کی فقہ میں دسترس کا ہر اہل علم معترف ہے لیکن ان کی فقہی آراء میں ایک مقلد کی نہیں بلکہ مجتہد کی شان نظر آتی ہے، ان کا ترجمہ قرآن ''فتح الرحمٰن''، تفہیمات الہیہ، البدور البازغہ، انفاس العارفین، الطاف القدس، حجتہ اللہ البالغہ، ازالہ الخفاء، فیوض الحرمین، القول الجمیل، المسوی، المصفی، سطعات، ہمعات اور آپ کی دوسری تصانیف کا مزاج دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ شاہ صاحبؒ کسی طے شدہ راہ پر چلنے کے عادی نہ تھے بلکہ ماضی سے کامل ارتباط کے ساتھ ساتھ مستقبل کی طنابیں اپنے ہاتھ میں رکھتے ہیں۔

ان تمام تصانیف میں وہ محض ان تقاضوں کو پورا کرتے نظر نہیں آتے جو تالیف و تصنیف کے لیے ضروری ہیں بلکہ وہ ذہنوں کی تشکیل اور افکار کی نئے سرے سے ترتیب اور سیرت و کردار کی تہذیب کو اوّلیت دیتے ہیں۔

انہوں نے ترجمہ قرآن محض یہ سمجھ کر نہیں کیا کہ یہ کام باعث اجر و ثواب ہے بلکہ یہ فریضہ اس لیے انجام دیا تاکہ انسانوں کو معلوم ہو کہ قرآن حکیم ایک صحیفہ انقلاب اور انسانی اداروں کی تعمیر نو کا مکمل نصاب ہے، اس کام کے لیے انہیں لوگوں کی مخالفت، شورش اور حملوں کا سامنا کرنا پڑا لیکن آج کوئی بھی عالم جب قرآن حکیم پر کام کرتا ہے تو وہ شاہ صاحبؒ کے ترجمۃ القرآن، حواشی اور الفوز الکبیر سے بے نیاز نہیں رہ سکتا، آج ہزاروں صفحات کو محیط مختلف تفاسیر شاہ صاحبؒ کے ترجمہ القرآن اور مختصر حواشی کے شائد ہی ہم پلہ بن سکیں، اس لیے کہ ان تفاسیر میں تالیف کی جھلک ہوتی ہے اور شاہ ولی اللہؒ کے حواشی میں تصنیف کی شان ہے، جس میں اوریجنلٹی اور اپروچ کا حسن ہے۔

شاہ صاحبؒ کی شہرہ آفاق تصنیف ''حجتہ اللہ البالغہ'' پڑھ کر معلوم ہوتا ہے کہ دین صرف اخروی زندگی اور اس کی سعادتوں کے حصول کے لیے نہیں بلکہ دنیا کا کوئی بھی نظام اس وقت تک انسان کے لیے کمال اور ترقی کا باعث نہیں بن سکتا، جب تک وہ

دین کے ساتھ منسلک نہ ہو، دین کا کوئی حکم ایسا نہیں جو اپنے دامن میں الٰہی حکمت اور انسانی سعادت کا خزانہ نہ رکھتا ہو۔

آج اسلام کو مکمل ضابطہ حیات اور دین کو زندگی کے مسائل کا حل ثابت کرنے کا جو رجحان عام ہے اور ہر ذی شعور اور صاحب علم اس نظریے کا قائل اور حامل نظر آتا ہے یہ ذہن بنانے اور اس سوچ کو قبولیت عامہ کا درجہ دلانے میں ''حجتہ اللہ البالغہ'' کا بہت بڑا کردار ہے، اگر تصوف اسلام کی تاریخ اور اس تاریخ کا فلسفہ پڑھنا ہو تو آپ کی تصنیف ''ہمعات'' پڑھنی چاہیے اور اس کے ساتھ ساتھ انفاس العارفین، الطاف القدس، اور سطعات کا مطالعہ اس امر کا پتہ دیتا ہے کہ شاہ ولی اللہؒ جیسا مفسر، مترجم، متکلم اور فقیہ اس باب میں علمی و عملی دونوں حوالوں سے کتنی مہارت رکھتا ہے، اور تصوف کے معاملے میں انؒ کا نقطہ نظر کتنا متوازن، حقیقت پسندانہ، عملی اور صائب ہے، ایک جگہ فرماتے ہیں:

''وہ ہمارے گروہ میں سے نہیں جس نے کتاب اللہ پر غور نہ کیا ہو اور نبی کریمؐ کی احادیث میں فہم و بصیرت حاصل نہ کی ہو، وہ ہم میں سے نہیں، جس نے ایسے علماء کی صحبت ترک کر دی ہو، جو صوفیاء ہیں، اور انہیں کتاب و سنت میں درک ہے، وہ ہم میں سے نہیں جو اصحاب علم سے کنارہ کش ہو گیا ہو جو تصوف میں بہرہ رکھتے ہوں، اور ایسے محدثین کی صحبت میں نہ بیٹھا ہو جو محدثین کے ساتھ ساتھ فقہاء بھی ہوں، وہ ہم میں سے نہیں جس نے ایسے فقہاء کی صحبت ترک کر دی ہو جو علم حدیث بھی جانتے ہیں، باقی رہے جاہل فقہاء، اور وہ علماء جو تصوف کا انکار کرتے ہیں، تو یہ دونوں کے دونوں چور اور رہزن ہیں'' (تفہیمات الہیہ)۔

مولانا عبید اللہ سندھیؒ کہتے ہیں کہ:

''قرآن عظیم کے بعد حدیث اور فقہ کی تعلیم کے لیے یہ کافی سمجھتا ہوں کہ شاہ ولی اللہؒ کی کتاب ''المسویٰ'' جو موطا (امام مالکؒ) کی شرح ہے پڑھ لی جائے، میرے

نزدیک قرآن اور اس کے بعد ''المسوّیٰ'' اسلام کی تعلیم کا ایک مکمل نصاب ہے میں یہ اسلام دنیا کو سکھا سکتا ہوں، مسلمانوں کو ان کے آئمہ کے طریقے پر اور غیر مسلموں کو عام حکمت کے اصولوں پر'' (شاہ ولی اللہؒ اور ان کا فلسفہ)۔

شاہ ولی اللہؒ نے جب اور جتنا کچھ فقہ پر کام کیا اس کا مقصد فقہی حوالے سے امت میں بعد اور افتراق پیدا کرنا نہیں بلکہ مشترکات کو نمایاں کرنا ہے، اور موافقات پر امت کو جمع کرنا ہے اور اس کے ساتھ ساتھ ارتفاقات پر آپ کا کام ہر اس شخص کو دین کے قریب لے آتا ہے جو مسلمانوں کے مابین اختلافی امور کے باعث مذہب سے دور ہو جائے یا کم علمی کے سبب مسئلے کی نوعیت اور حکمت کو نہ سمجھ پائے اور دین سے بیگانگی کو اپنا شعار بنا لے! شاہ ولی اللہؒ کے اس مزاج کو عکس صرف ان کی فقہی آراء میں نظر نہیں آتا بلکہ پوری شخصیت ہی اس عکس کی حامل ہے، آج ہندو پاک میں مقلد اور غیر مقلد کی کتنی گہری تفریق ہے، دیوبندی اور بریلوی مکتب فکر کے درمیان کتنے فاصلے ہیں، ایک دوسرے کے رد میں بے بہا لٹریچر لکھا اور چھاپا جا چکا ہے، نصاب تعلیم تک الگ ہے، مدارس و مساجد کی تقسیم اس پر مستزاد! لیکن یہ سارے لوگ اپنی تمام تر شدت پسندی کے باوجود شاہ ولی اللہؒ پر متفق نظر آتے ہیں، دورہ حدیث کی سند دیتے وقت ان کے درمیان نقطہ اتصال شاہ ولی اللہؒ کی ذات بنتی ہے، اس سے زیادہ شاہ صاحب کی جامع شخصیت پر اور کیا دلیل لائی جاسکتی ہے؟

میرے نزدیک حضرت شاہ ولی اللہؒ کا اصل مقام اس وقت سمجھ میں آتا ہے جب ہم اس وقت پوری دنیا میں ایک عالمی اسلامی تحریک کا چرچا اور غلغلہ سنتے ہیں، آج یورپ ہو یا ایشیا، افریقہ ہو یا امریکہ، ہر جگہ اسلامی تحریک کا احیاء ہو رہا ہے، پورا عالم اسلام کروٹ بدل رہا ہے الجزائر کی سیاست ہو یا مصر کی پارلیمنٹ، سوڈان کے میدان ہوں یا لیبیا کے صحرا، ترکی کی زرق برق سوسائٹی ہو یا افغانستان کے کوہ و دمن، افریقہ کے جنگلات ہوں یا یورپ کا قلب، غزہ کی پٹی ہو یا انڈونیشیا کے جزیرے ہر جگہ اسلامی

تحریک کی دھمک سنائی دے رہی ہے، پاکستان میں مسلمانوں کی واضح اکثریت ہو یا بھارت کی مظلوم مسلم اقلیت، کشمیر کی برف پوش پہاڑیاں ہوں یا شی شان کے پر پیچ راستے ہر کہیں اسلامی تحریک کی گونج ہے، اس عالمی اسلامی تحریک کے قالب میں شاہ ولی اللہؒ کی بے تاب روح بہر حال کارفرما ہے، شاہ صاحب نے مسند حدیث کو عزت بخشی، محراب و منبر کو رونق عطا کی، تصنیف و تالیف کے گوشے کو منور کیا، خانقاہ کو آباد رکھا، لیکن ایک خواب ہمیشہ ان کے شبستان فکر و خیال میں منتظر تعبیر رہا کہ مسند حدیث پر رونق افروزی بجا، محراب و منبر کا تقدس اپنی جگہ، تصنیف و تالیف کی اہمیت مسلم، خانقاہ کی روح پرور اور عرفان آمیز ماحول سر آنکھوں پر، مگر یہ سب کچھ اس وقت تک نتیجہ خیز نہیں ہوسکتا جب تک کہ اہل اسلام کو سیاسی اقتدار نصیب نہ ہو، جب تک کہ دین پوری دنیا پر غالب نہ ہو جائے اور جب تک کہ کفر سرنگوں نہ ہو جائے۔

چنانچہ شاہ ولی اللہؒ نے اسلام کو بطور نظام حیات پیش کرنے میں پوری محنت صرف کی، ان کی دیگر ساری سرگرمیوں کا محور یہی خیال تھا، کتابیں بھی اسی لیے لکھیں، خانقاہ میں لوگوں کی تربیت بھی اسی لیے کی، قرآن فہمی کا سلسلہ بھی اسی لیے قائم کیا، اور اصول فقہ کی ترتیب نو اور حکمت دین کی نئی اور دلنشین تشریح بھی اسی لیے پیش کی تاکہ دین بطور نظام متعارف ہو، اس دور میں جب سیاسی طوائف الملوکی عروج پر تھی، ایسٹ انڈیا کمپنی وارد ہند ہو رہی تھی، پورا خطہ ایک طرح سے سیاسی، معاشی، اور ثقافتی "دردزہ" میں مبتلا تھا، شاہ ولی اللہؒ نے ان معاملات میں پوری پوری دلچسپی لی، کبھی فلک کل نظام کا نعرہ بلند کر رہے ہیں، کبھی احمد شاہ ابدالی کو دعوت دے رہے ہیں، غرض کہ ایک پارے کی طرح ہر وقت تھرکتے نظر آتے ہیں، آپ نے تیزی سے بدلتے ہوئے حالات کا بڑی دقت نظر سے مشاہدہ کیا، شاہ صاحبؒ نوٹ کر رہے تھے، کہ سلطنت مغلیہ ایک ٹمٹماتا چراغ ہے، اس میں قیصر و کسریٰ کی خرابیاں پیدا ہو چکی ہیں، ایک بار پھر مصلحت خداوندی کا تقاضا ہے کہ اس نظام کو توڑ کر نئے نظام کی بنیاد رکھنی چاہیے۔

انہوں نے مغلوں کی بوسیدہ شاہی عمارت کو تھامنے کی کوئی تحریک نہیں اٹھائی اور مسلمانوں کے زوال آمادہ اونچے طبقوں کے بجائے عوام کو مخاطب کیا اور ہندوستان بھر اور اردگرد کے علاقوں میں ایک طرح کی احیائی تحریکیں شروع ہو گئیں، بعد میں سرسید کا تعلیمی مشن ہو یا مولانا محمد علیؒ کی تحریک خلافت، معرکہ بالاکوٹ ہو۔ یہ سب شاخیں ہیں تحریک ولی اللہؒ کی! اور اس تحریک کی صدائے بازگشت آج بھی سنائی دے رہی ہے۔

آج دنیا میں اقتصادی توازن اور معاشی انصاف کا بڑا چرچا ہے، اور اشتراکی مینی فیسٹو کو بائبل کا سا تقدس حاصل ہے جب کہ شاہ ولی اللہؒ نے اپنی سیاسی تحریک کا سرنامہ ہی اقتصادی مساوات اور انصاف کو قرار دیا تھا، کارل مارکس نے جو کچھ کہا اور لکھا ہے اس میں سے شاید ہی کوئی بات ایسی ہو جو نابغہ عصر شاہ ولی اللہؒ نے اپنے دور میں نہ کہی ہو اور اپنے مقالات میں نہ لکھی ہو، مارکس کا سوشلسٹ مینی فیسٹو 1847ء میں شائع ہوا جبکہ شاہ ولی اللہؒ 1763ء میں وفات پا چکے تھے، اس موضوع پر ظاہر ہے بہت کام ہوا ہے اور بے اندازہ کام کی ابھی ضرورت ہے تاہم اس سے یہ واضح ہوتا ہے کہ قدرت نے شاہ ولی اللہؒ کو جس ذہانت، فطانت، حکمت اور عبقریت سے نوازا تھا، شاہ صاحب نے اس نعمت کا ٹھیک شکر بھی ادا کیا، اور اپنی ذہنی و عملی اور فکری و روحانی صلاحیتوں کو صحیح اندازے سے اور درست مواقع پر استعمال کیا، کروڑوں اربوں انسانوں کی دنیا میں جن نفوس و اشخاص کو تاریخ میں ایک بلند اور مستقل مقام اور تشخص حاصل ہے بلا جھجک ان میں شاہ ولی اللہؒ کو شامل کیا جا سکتا ہے۔

☆☆☆☆

سفیر عشق رسولؐ

مردم خیز خطہ ہندو پاک میں ایک نمایاں ترین اور قابل صد احترام نام حضرت مولانا احمد رضا خاں بریلویؒ کا ہے، جنہیں اہلسنت بریلوی مکتب فکر میں ''اعلیٰ حضرت'' اور ''فاضل بریلوی'' ایسے باوقار القاب سے یاد کیا جاتا ہے، بلاشبہ فاضل بریلویؒ کی شخصیت ایک ہمہ جہت اور بھرپور شخصیت ہے، تفسیر، حدیث، ترجمہ، فقہ، شعر و ادب اور میراث میں ان کا درک اور رسوخ ان سے ہزار اختلاف کے باوجود مسلم ہے۔

حکیم الامت علامہ اقبالؒ نے بجا طور پر انہیں برصغیر میں امام ابوحنیفہؒ کا جانشین قرار دیا ہے، ان کے مشہور فتاویٰ رضویہ کی ضخامت اور ثقاہت کسی اہل علم سے پوشیدہ نہیں، فقہی مسائل میں ان کی رائے کبھی جادہ اصابت سے ہٹتی نظر نہیں آئی اور فقہاء کے جملہ ذخیرہ علم پر ان کی نظر کا اعتراف ہر اس شخص کو ہے جسے کسی بھی درجے میں فقہ اور اصول فقہ سے مس ہے۔

لیکن میرے پیش نظر فاضل بریلویؒ کی شخصیت کے تمام یا متعدد پہلوؤں کا احاط نہیں بلکہ عنوان کے مطابق ان کی شخصیت کے نمایاں ترین عنصر ترکیبی کا تذکرہ مقصود ہے، جو تذکرہ بذات خود دل نواز، شوق انگیز، حلاوت آمیز اور روح پرور ہے، یہ موضوع چونکہ ہر مسلمان کی میراث ہے اس لیے راقم الحروف ایسا کج مج بیان بھی اشتراک احساس کی بنیاد پر اس سلسلے میں اپنے دل کی دھڑکنوں کو زبان دے سکتا ہے، اور محسوسات کو نوک قلم پر لا سکتا ہے۔

عرب و عجم کے متعدد نامور اہل علم و قلم نے فاضل بریلویؒ پر کام کیا ہے اور اپنے ذوق کی مناسبت سے اظہار خیال کیا ہے، فاضل بریلویؒ کا تفسیری کام کس پائے کا ہے؟ ظاہر ہے کوئی مفسر اس پر رائے دے گا، ان کے ذوق حدیث پر کوئی محدث قلم اٹھا سکتا ہے، ترجمہ میں ان کی مہارت کا کیا عالم ہے کسی کہنہ مشق مترجم کا کام ہے کہ وہ اس پر لکھے، فقہی اعتبار سے فاضل بریلویؒ کا مقام کیا ہے؟ کوئی فقیہ ہی بہتر فیصلہ کر سکتا ہے، شعر و ادب کے میدان میں مرحوم کتنا کامیاب رہے؟ نثر و نظم کے ماہرین نے اس پر مفید تبصرے کئے ہیں، علم المیراث میں فاضل بریلویؒ کے درک و رسوخ کے متعلق اس فن کا کوئی ماہر ہماری رہنمائی کر سکتا ہے، لیکن عشق رسولؐ ایسا موضوع ہے جس کی روشنی سے کسی مسلمان کا دل محروم نہیں، جس کی تپش سے ہر سینہ آشنا ہے جس کا گداز ہر کلمہ گو محسوس کر سکتا ہے، عشق رسولؐ کوئی فن نہیں کہ کوئی صاحب فن ہی اس پر اظہار خیال کرے اور کوئی شعبہ علم نہیں کہ کوئی بڑا عالم یہ گتھی سلجھائے، بلکہ یہ سراسر کیفیت ہے، ذوق ہے، تڑپ ہے، وارفتگی ہے، والہانہ پن ہے، سوز دروں ہے، گداختگی اور شیفتگی ہے عین ممکن ہے کوئی غازی علم الدین شہیدؒ ایسا محنت کش اس میدان میں الفارابی اور البیرونی سے بہت آگے ہو، کوئی دیوانہ اپنے عہد کے تمام فرزانوں سے بازی لے جائے، کوئی سادہ لوح کسی نکتہ سنج سے زیادہ خوش نصیب ہو، اور کوئی خاک بسر اور چاک گریباں اس کوچے کا زیادہ راز دار ہو، اس حوالے سے میں حق رکھتا ہوں کہ فاضل بریلویؒ کے اس پہلو پر بات کروں جو بات قند و نبات سے زیادہ شیریں ہے۔

بدقسمتی سے برصغیر پاک و ہند فرقہ واریت کی آکاس بیل میں بری طرح لپٹا ہوا ہے اس لیے ہر شخصیت کے بارے میں کچھ اس طرح کا تاثر بنا ہوا ہے۔

جس کو چاہا خمار میں چاہا
جس کو دیکھا غبار میں دیکھا

چاہنے والے اپنے ممدوح کو سدرۃ المنتہیٰ پر پہنچاتے اور گرانے والے تحت الثریٰ

سے کم پر راضی نہیں ہوتے، اس اعتبار سے فاضل بریلویؒ مظلوم ہیں کہ ان کے ساتھ بھی انصاف یا رحم کا معاملہ نہیں کیا گیا، اس میں کیا شک ہے کہ کسی شخصیت کے ہر پہلو سے اتفاق ضروری نہیں ہوتا لیکن یہ بھی تو لازم نہیں آتا کہ ہر پہلو سے اختلاف ہی کیا جائے اس معاملے میں صوفیاء کرام بازی لے گئے ہیں کہ ان کا مزاج ہی یہ رہا ہے کہ جب خوبی دیکھنا چاہی تو غیر کے اندر ڈھونڈھی اور جب عیب کی جستجو ہوئی تو اسے اپنے اندر پایا، اور یہی جوہر آدمیت اور معراج انسانیت ہے۔

صوفیاء کو کبھی دینے والے کی کثرت عطا میں خامی نظر نہیں آئی انہیں ہمیشہ اپنے ہی دامن کی تنگی کا احساس رہا، وہ برملا کہتے رہے کہ ساقی کی مے بے درد اور صاف تھی مگر ہمارے پیمانے کی میل نے اسے گدلا کر دیا، کاش ہم سبھی اس مزاج کا دل رکھتے ہوں کہ وہ نفرت کی آندھیوں میں بھی محبت کا چراغ اپنے طاقچے میں سجائے رکھے، مجھے تسلیم ہے کہ فاضل بریلویؒ کا بعض معاملات میں لب ولہجہ بڑا تلخ رہا، بعض پہلوؤں سے ان کی ترشی قلم آشکارا ہے، بعض گوشے ان کی تندی اور شدت کی چغلی کھاتے ہیں لیکن یہ طے ہے کہ وہ معاملہ، وہ پہلو اور وہ گوشہ عشق رسول کا ہے، محرک سراسر یہی ہے اس کے علاوہ قسم بخدا کچھ نہیں اور اس کی رعایت انہیں ملنی چاہیے، چشمہ جب ابل پڑے تو چاروں کونوں پر پانی گرتا ہے، دل کی دھڑکن تیز ہو جائے تو اسے ''ملٹری سٹائل'' ڈسپلن میں رکھنا ناممکن ہے، عقل کے ہر باریک نکتے کو بار بار چھلنی سے گزارنے میں کوئی حرج نہیں لیکن عشق کی شوخی ہر مذہب وملت میں لائق عفو ہوتی ہے، اس شوخی میں بسا اوقات گریبان تار تار ہو جاتے ہیں، ہو جانے دیجئے، کہ یہی بارگاہ عشق کے آداب ہیں، اللہ تعالیٰ کے ہاں اعمال کا دارومدار نیت پر ہوتا ہے اور اگر نیت میں عشق رسول کار فرما ہے تو کسی عاشق کی تلخی کی شہد ناب کا درجہ دینا چاہیے، ہم دنیوی اغراض اور تجارتی مقاصد کے لیے کیسے کیسے تلخ تجربے اور تبصرے سن کر چپ ہو جاتے ہیں کہ چپ رہنے ہی میں فائدہ نظر آتا ہے، تو کیوں نہ اس بات میں کسی کے جذبات کو مثبت نگاہوں سے

دیکھا جائے اگر میں مفتی کے منصب پر فائز ہوتا تو میرا فتویٰ ہے کہ کسی عاشق کے پتھر فقیہ و متکلم کے پھولوں سے زیادہ نرم و نازک ہوتے ہیں۔

خیر یہ تو جملہ معترضہ تھا نجانے میں کس کیفیت میں کھو گیا بات ہو رہی تھی فاضل بریلویؒ کے سفیر عشق رسولؐ ہونے کی، اس باب میں ان کے نثر پارے کیسے شہ پارے ہیں اہل نظر سے مخفی نہیں مگر ان کا نعتیہ دیوان ''حدائق بخشش'' اپنے دامن میں جو جذبات کی فراوانی، محبت کا غلبہ، درد اور سوز کی کیفیت، والہانہ پن، خوبصورت سلیقہ اظہار اور جذب و مستی میں ڈوبے ہوئے الفاظ و حروف رکھتا ہے اسے ''مولوی'' نہیں ''صوفی'' بن کر پڑھیئے تو دل دھک کر اٹھتا ہے، آنکھیں ابل پڑتی ہیں، کلیجے پر برف پڑ جاتی ہے، جگر تھامے نہیں تھمتا، روح سرشار ہو ہو جاتی ہے اور دماغ معطر اور معنبر ہو جاتا ہے، اس پیارے کی بات ایسے پیارے لہجے میں کی گئی ہے کہ اپنے آپ پر پیار آنے لگتا ہے، دنیا میں قوس قزح کی معصومیت کے چرچے ہیں، چاندنی کی ٹھنڈک کی باتیں ہوتی ہیں، شبنم کی پاکیزگی ضرب المثل ہو کر رہ گئی ہے، گلاب کی شادابی کی کیا بات ہے، غنچے اور کلی کی لطافت اپنی جگہ مسلمہ ہے، ہیرے کی آب و تاب کا جواب نہیں، نسیم سحر کی جادوئی خوشبو کا زمانہ معترف ہے، تاروں کی لو بڑی دلآویز ہوتی ہے، کنول کے پھول بڑے شفاف ہوتے ہیں، ہرنی کی چال میں بڑا بانکپن ہوتا ہے، کوئل کی نغمگی سبحان اللہ، آبشار کی گونج ماشاء اللہ، کچی مٹی کی سوندھی مہک کیا کہنے، اور پنکھڑی کی ناز کی واہ واہ۔

مگر خدا لگتی بات ہے فاضل بریلویؒ نے نعت رسولؐ میں جو گھلاؤ اور رچاؤ پیدا کیا ہے، جو کیفیت اور جو معنویت پیدا کی ہے، جو رنگ اور جو نور پیدا کیا ہے اس کا جواب نہیں، اور دل بے اختیار پکار اٹھتا ہے کہ جس ذات ستودہ صفات کا پیرہن کاغذی اتنا خوبصورت ہے وہ خود کتنی دلآویز اور دلربا شخصیت ہو گی، سب سے بڑھ کر یہ کہ فاضل بریلویؒ یہاں فقط قادر الکلام شاعر نظر نہیں آتے جو الفاظ سے کھیلتا ہے، کہنہ مشق شاعر

معلوم نہیں ہوتے جو استادانہ فن کا مظاہرہ کرتا نظر آئے، بلکہ صرف اور صرف عاشق زار، مشتاق دیدار اور زائر اشکبار نظر آتے ہیں، اگر چہ ان کے قادر الکلام اور کہنہ مشق شاعر ہونے میں کوئی شک نہیں ملک سخن میں ان کی شاہی مسلم ہے، ہر سمت ان کے سکے بٹھانے کا دعویٰ درست ہے، مگر اس راہ میں تو انہوں نے پلکیں بچھا دیں، اس میخانے میں تو اپنی حسرتیں لٹا دیں، اور اس مکتب میں اپنی دانائیاں گنوا دیں، انہوں نے پارہ جگر سے لفظ اور اشک چشم سے حرف تراشے ہیں، تب حدائق بخشش تیار ہوا ہے۔

بعض نعتوں میں وہ رنگ تغزل ہے کہ جس کے سامنے غزل کی رابا حیت شرما جاتی ہے، بعض شعر ایسے ہیں جو روح القدس کی تائید کے بغیر کہے نہیں جا سکتے، کچھ شعر اس پائے کے ہیں کہ اقلیم سخن کے تاجدار ان کے سامنے کورنش بجالاتے نظر آتے ہیں، ایسی نعتیں بھی آپ کے قلم اور زبان سے ادا ہوئی ہیں کہ اگر جامیؒ وقدسیؒ اس عہد میں ہوتے تو وہ اردو سیکھنے کی آرزو کرتے تا کہ براہ راست لطف اور حظ اٹھا سکیں، میری رائے میں فاضل بریلویؒ کا یہ پہلو اتنا تابناک اور شاندار ہے کہ کوئی صاحب ذوق اس سے صرف نظر کر کے اپنے آئینہ ذوق کو صیقل نہیں کر سکتا، آیئے ہم مل کر رنگ ونور اور جذب وسرور کے دوش پر سوار ہو کر عشق ومحبت اور کیف ومستی کی وسعتوں میں سفر کریں، ایک جگہ یہ آہنگ نظر آتا ہے جو محتاج تشریح نہیں۔

وہ کمال حسن حضورؐ ہے کہ گمان نقص جہاں نہیں
یہی پھول خار سے دور ہے یہی شمع ہے کہ دھواں نہیں

ایک اور مقام ملاحظہ ہو:

جس کے تلووں کا دھوون ہے آب حیاب
ہے وہ جان مسیحا ہمارا نبی ﷺ

یہ شعر بھی پڑھیئے اور سر دھنیئے:

لحد میں عشق رخ شہ کا داغ لے کے چلے
اندھیری رات سنی تھی چراغ لے کے چلے

اس شعر کا دنیائے نعت میں آخر کیا جواب ہوسکتا ہے ملاحظہ فرمائیے

کروں تیرے نام پہ جاں فدا نہ بس ایک جاں دو جہاں فدا
دو جہاں سے بھی نہیں جی بھرا کروں کیا کروڑوں جہاں نہیں

حضورؐ کے جود و کرم، نوازش و مہربانی اور فیض و عطا کا کن پیارے الفاظ میں نقشہ کھینچتے ہیں۔

نعتیں بانٹتا جس سمت وہ ذیشان گیا
ساتھ ہی منشئ رحمت کا قلمدان گیا

المختصر فاضل بریلویؒ کے قلب وضمیر میں عشق رسولؐ کا فقط گل صد برگ نہیں پورا گلستان آباد و شاداب ہے جس سے دل و جاں مہک رہے ہیں۔

☆☆☆☆

اب انہیں ڈھونڈ چراغِ رخ زیبا لے کر

ایک آدمی اگر کوہ ہمالیہ کی چوٹی پر کھڑا ہوا ہو اور وہ نیچے کی طرف دیکھے تو اسے ہر چیز بہت چھوٹی نظر آئے گی، خواہ وہ چیزیں اپنے طور پر بہت بڑی ہوں، اس لیے کہ وہ خود بہت بلندی پر کھڑا ہوتا ہے، لیکن وہی شخص اگر اپنے اوپر آسمان کی طرف دیکھے تو وہ خود کو آسمان کی وسعت کے مقابلے میں بہت سکڑا ہوا، اس کی بلندی کے سامنے اپنے آپ کو بہت پست اور اس کے حجم کے تناظر میں اپنی ذات کو رائی کے دانے کے برابر سمجھے گا۔

کچھ اسی طرح کی صورتحال کا سامنا اس شخص کو کرنا پڑتا ہے جو عالم اسلام کی عبقری شخصیت اور برصغیر کی انتہائی عظیم المرتبت ہستی اعلیٰ حضرت فاضل بریلویؒ کے بارے میں کچھ کہنا اور ان پر کچھ لکھنا چاہتا ہو، اس دور کا کوئی بڑے سے بڑا عالم، فاضل، مفتی، فقیہ، محدّث، مفسّر، متکلّم، مصنّف اور شاعر، علوم وفنون کے کوہ ہمالیہ پر کیوں نہ کھڑا ہو اور ہر ایک اس کے سامنے بونا اور ٹھگنا کیوں نظر آ رہا ہو مگر جب وہ اعلیٰ حضرت فاضل بریلویؒ جیسے علم و فضل، اور تحقیق و تصنیف کے آسمان پر نظر ڈالتا ہے تو دوسرں کا کیا مذکور وہ خود اپنے آپ کو بہت کوتاہ قامت اور پست شخصیت نظر آنے لگتا ہے، ان پر بات کرتے ہوئے بڑے سے بڑے خطیب کی زبان لڑکھڑانے لگتی ہے اور بڑے سے بڑے ادیب کی نوک قلم سے الفاظ ٹوٹ ٹوٹ کر گرنے لگتے ہیں، نہ زبان کی باگ ہاتھ میں رہتی ہے اور نہ قلم کی رکاب پاؤں میں، یک رخا آدمی بھلا کہاں تک ہمہ

جہت شخصیت کو اپنے فکر وخیال کے دائرے میں قابو رکھ سکتا ہے۔

دراصل فاضل بریلویؒ کی شخصیت ایک ہشت پہلو ہیرے جیسی ہے۔ جسطرح اسے سورج کی روشنی کے رخ پر رکھا جائے تو ہر کونے سے ایک نیا رنگ نظر پڑتا ہے کسی سمت سے سنہری، کسی جانب سے نیلا، کسی طرف سے سرخ، کسی پہلو سے سبز، کسی زاویے سے نارنجی اور کسی گوشے سے آسمانی رنگ جھلکتا ہے۔

اعلیٰ حضرتؒ کو بھی آفتاب علم کی روشنی میں دیکھا جائے تو ان کی شخصیت کے کئی رنگ اپنے اندر دل ونگاہ کی جاذبیت کا سامان لیے ہوئے ہیں، ان کے بارے میں سن کر یا پڑھ کر زبان پر بے اختیار آجاتا ہے۔

کوئی تصویر نہ ابھری تیری تصویر کے بعد
ذہن خالی ہی رہا کاسۂ سائل کی طرح

تفسیر، ترجمہ، حدیث، فقہ، کلام، بیان، معانی، فلسفہ، منطق، مناظرہ، عقائد، ان میں سے ایک ایک شعبہ علم انسان سے پوری زندگی صرف کرنے کا مطالبہ کرتا ہے، لیکن فاضل بریلویؒ کے ہاں تو ان روائتی اور قدیم علوم کے ساتھ ساتھ عقلی اور جدید علوم کا ذخیرہ نظر آتا ہے اگر کوئی آدمی ایک بار اس ذخیرے میں قدم رکھ لے تو وہ زندگی بھر واپسی کا راستہ بھول جائے۔

علم الکیمیا سے علم الادویہ اور شماریات سے ارضیات اور جغرافیہ سے معاشیات تک ایک طویل اور وسیع سلسلہ ہے جس کی ایک ایک کڑی فاضل بریلویؒ نے اپنے ہاتھ سے سلجھائی اور سنواری ہے۔

ہم نے آج کے دور میں ایسے کئی نامور اہل دانش وصاحب علم دیکھے ہیں جنھوں نے چشمہ علم و دانش سے بمشکل دو گھونٹ بھرے اور انہیں ابکائیاں شروع ہوگئیں، جی متلانے لگا اور پیٹ میں قراقر اٹھنے لگے، کوئی تجدّد کے خبط میں مبتلا ہو گیا، کسی نے اعتزال کی راہ اپنالی، کچھ نے دین کی نئے سرے سے تہذیب وتشکیل کا فریضہ سنبھال

لیا، بعض اسلاف پورے اثاثہ فکر کو تیلی دکھانے پر تل گئے، کئی ایسے بھی ہوئے کہ ہلدی کی گانٹھ لے کر پنسار بن بیٹھے اور وہ بھی ہیں جنہیں اپنی مٹی پر چلنے کا سلیقہ نہ آیا اور سنگ مرمر پہ چلنے لگ گئے جس کے نتیجے میں قدم قدم پر پھسلنے لگے مگر فاضل بریلویؒ پورا میخانہ علم و دانش نوش جان کر کے بھی لمحے بھر کو نہیں لڑکھڑائے، اور اپنی جڑوں پہ قائم رہے۔

علم کے دعویدار تو بے شمار نظر آتے ہیں مگر ناموس علم کے پاسدار بہت کم ہوتے ہیں، علم نگلنے والے لوگوں کی فہرست تو بہت طویل ہے مگر اسے ہضم کرنے والے بہت قلیل ہیں، اپنے علم کو بزم ناز کی زینت بنانے والے کسی دور میں کم نہیں رہے مگر اپنے سرمایہ علم کی بارگاہ نیاز میں لٹانے والے ڈھونڈنے سے خال خال ملتے ہیں، محض علم چاٹنا اور بات ہے لیکن فیض عشق بانٹنا چیزے دیگر! مکتب و مدرسہ کی راہ کسی نے نہیں دیکھی، مزہ تو جب ہے کہ آدمی گمراہ نہ ہو، کتاب کون نہیں پڑھ سکتا۔ لطف تو تب ہے کہ صاحب کتاب سے نسبت جڑی رہے، قلم و قرطاس سے کون واقف نہیں، بات تو تب بنے کہ جان و دل حرف ناشناس معلم اور قرطاس نا آشنا مربی کے لیے وقف ذہین، بابا ذہن شاہ تاجیؒ فرمایا کرتے تھے:

شیخ میخانے میں آنے کو مسلماں آیا
کاش میخانے سے نکلے تو مسلماں نکلے

ہمیں اعلیٰ حضرت فاضل بریلویؒ کے ہاں یہ بات نظر آتی ہے کہ وہ علم کے ساتھ ساتھ ناموس علم کا پاس رکھنے والے تھے، ریاست نانپارہ کے والی کے ہاں ہونے والی خصوصی تقریب پر مدحیہ قصیدہ لکھنے کے بجائے اپنے آقا و مولاؐ کی نعت لکھ کر بھیج دیتے ہیں اور نعت بھی وہ جس میں تغزل اپنے عروج پر ہے اور تقدس بھی نقطۂ کمال پر۔

وہ کمال حسن حضور ہے، کہ گمان نقص جہاں نہیں
یہی پھول خار سے دور ہے، یہی شمع ہے کہ دھواں نہیں

وہ جو عرب کے مایہ ناز شاعر فرزدق نے کہا تھا کہ شاعری میں بعض مقامات ایسے آجاتے ہیں کہ سجدہ واجب ہو جاتا ہے فاضل بریلویؒ کا یہ شعر اسی پائے کا ہے، جہاں ذوق اور وجدان کی پیشانی بے اختیار جھک جاتی ہے، اور اس نعت کا مقطع تو غضب کا ہے جس میں اہل زر کی دولت پر طنز اور سید الکونینؐ کی دریوزہ گری پر فخر کا اظہار ہے اور ساتھ ساتھ مسند علم وفقر کا وقار ہے:

کروں مدح اہل دول رضا پڑے اس بلا میں مری بلا
میں گدا ہوں اپنے کریم کا میرا دین پارہ ناں نہیں

آج کل ''عبقری'' اور ''نابغہ'' کا لفظ بہت سستا ہو گیا ہے اور ہر تیسرا چوتھا پڑھا لکھا آدمی خود کو ''عبقری'' اور ''نابغہ'' کہلوانے پر مصر ہے اور ''علامہ'' ہونا تو ہر ایک کے بائیں ہاتھ کا کھیل بن گیا ہے، جس کی بازار میں ذرا سی ''بکری'' ہو وہ عبقری بن جاتا ہے اور جس کو معمولی سی ''قوت ناطقہ'' مل جائے وہ ''نابغہ'' ہو جاتا ہے حالانکہ سر منڈوانے سے کوئی قلندر اور یونان میں پیدا ہونے سے سکندر نہیں بن جاتا، آدابِ قلندری سے ہر شخص آگاہ نہیں ہوتا اور شان سکندری کا ہر فرد حامل نہیں ہوتا، اس لیے عبقری اور نابغہ صدی بھر میں دو چار ہی ہوتے ہیں، اگر ان کی قطاریں لگنی شروع ہو جائیں تو ہر ڈھیلے کے نیچے سے ارسطو اور افلاطون ہی برآمد ہوں گے، صورتحال اگر اس طرح ہو تو کسان کھیتوں میں گاجرِ مولی لگانے کے بجائے سقراط اور بقراط اگانا شروع کر دیں۔

بلاشبہ فاضل بریلویؒ عبقری عصر اور نابغہ روزگار شخصیت تھے، جن کی علمی تخلیقات سے استفادہ کرنے کے لیے بذات خود تخلیقی ذہن درکار ہے، روائتی ذہن تو چار قدم چل کر ہانپ جاتا ہے، میری بات پر اعتبار نہ آئے تو ان کی تصنیفات کی فہرست ملاحظہ کر لیجئے۔ متن تو دور کی بات ہے فقط کتابوں کے نام سمجھنے کے لیے ''المنجد'' جیسے لغت کی ہمہ وقت ضرورت لاحق رہتی ہے، مثلاً علم لوگارثم، علم تکسیر، علم زیجات، علم ارثماطیقی، علم

توقیت اور ٹریگنو میٹری پر ان کی تخلیقات پڑھنے اور سمجھنے والے لوگ اس خطے میں کتنے ہوں گے؟ شاید بڑی آسانی کے ساتھ انگلیوں پر گنے جا سکیں۔

فاضل بریلویؒ کی کوئی چھوٹی یا بڑی تصنیف ایسی نہیں ہے جس کا نام تاریخی نہ ہو یہ بھی تو تخلیقی ذہن کا کرشمہ ہے۔ حیرت ہے کہ جنہیں اپنی تاریخ پیدائش تک یاد نہیں وہ اعلیٰ حضرت کے منہ لگتے ہیں، انسائیکلو پیڈیا کا لفظ ہم سب نے سنا پڑھا ہے جس کا معنی ہے "جامع العلوم" وہ کتاب یا تالیف انسائیکلو پیڈیا کہلاتی ہے جس میں متعدد، متنوع اور متفرق علم جمع کر دیئے گئے ہوں مگر سچی بات یہی ہے کہ چلتی پھرتی اور سانس لیتی انسائیکلو پیڈیا فاضل بریلویؒ کی شخصیت ہے، جنہیں پچپن اقسام علم پر قسام ازل نے دسترس عطا کر دی تھی، ہزاروں صفحات پر مشتمل "فتاویٰ رضویہ" کی بارہ ضخیم مجلدات ہمارے اس دعوے کا ناقابل تردید ثبوت ہیں۔

اگر کسی انجان آدمی کے سامنے فاضل بریلویؒ کی جملہ تصانیف رکھ دی جائیں جن سے ایک کوٹھا بھر جاتا ہے تو وہ یقیناً یہی سمجھے گا کہ حکومت کی طرف سے کروڑوں روپے کی گرانٹ پر چلنے والے کسی ادارے نے باقاعدہ بیسیوں اہل قلم کا بورڈ بٹھا رکھا ہے جن کے ذمے شب و روز تحقیق و تصنیف کا کام ہے اور وہ قلم کار غم جاناں اور غم دوراں سے بے نیاز ہو کر لکھنے کا کام کرتے ہیں، ہر طرح کی فراغت اور سہولت نے ان سے اتنی کتابیں لکھوائیں ہیں، لیکن اسی آدمی کو اگر یہ بتا دیا جائے کہ یہ کام کسی ادارے، کسی اکیڈیمی، کسی بورڈ اور کسی ریسرچ انسٹی ٹیوٹ نے نہیں بلکہ کتابوں کا یہ انبار ایک ہی شخصیت کا تخلیقی شاہکار ہے تو اسے یہ ماننے کو ذہن بنانے کے لیے کئی ہفتے کا عرصہ درکار ہے، تب جا کر وہ سمجھ پائے گا:

مت سہل ہمیں جانو، پھرتا ہے فلک برسوں
تب خاک کے پردے سے انسان نکلتا ہے

اس سلسلے میں ایک اور بات بھی لائق توجہ ہے کہ لکھنے پڑھنے کا اتنا بھاری بھرکم

کام آدمی کے دماغ کا رس نچوڑ لیتا ہے، ہر وقت اس کی رگیں پھولی رہتی ہیں، جبین شکن آلودہ اور احساس کی دنیا گرد آلود ہو جاتی ہے، آدمی کرمِ کتابی بن کر رہ جاتا ہے، خشک موضوعات پر لکھتے لکھتے طبیعت پر خشکی کا لیپ چڑھ جاتا ہے، ذوق و کیف کا عالم اس کے لیے اجنبی بن جاتا ہے، ایسے آدمی کے بارے میں گمان بلکہ یقین ہو جاتا ہے کہ کوئی اس سے ذرا قریب ہو کر گزرا تو شاید وہ چھل جائے، کیونکہ یہ تجربہ ہے کہ کتابی علم چنگے بھلے اور بانکے سجیلے آدمی کو جلا بھُنا اور کھردرا بنا دیتا ہے، علم کی ہیبت اور خشونت اس درجہ بڑھ جاتی ہے کہ لفظ بیچارے کانپتے اور حرف ہانپتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں، لیکن فاضل بریلویؒ کو مبدأ فیاض نے علم و فن اگر منوں کے حساب سے دیا تو ذوق و عشق بحمد اللہ ٹنوں کی مقدار میں بخشا، ذوق غلامی رسولؐ کا اور عشق ذات مصطفیٰ کا، جب وہ مسند افتاء پر ہوں تو بالغ نظر مفتی، حدیث پڑھا رہے ہوں تو عظیم محدث فقہی مسائل پر بات کر رہے ہوں تو فقیہ اعظم اور فن میراث زیر غور ہو تو ماہر علم المیراث دکھائی دیتے ہیں، ان کی قامت پر ہر قبا خوب سجتی ہے، مگر جب وہ کوچہ نبیؐ میں ہوں تو ان کی شان گدائی پر دارا و سکندر کو رشک آنے لگتا ہے، جب وہ وقف ذکر رسولؐ ہوتے ہیں تو وجدان درود پڑھنے لگتا ہے، جب ان کے ہاتھ میں نعت کا کشکول ہوتا ہے تو فرشتے بھیک مانگنے کو قطار اندر قطار زمین پر اترتے دکھائی دیتے ہیں، جب ان کے لبوں پر نام مصطفےٰؐ آتا ہے تو شہد کی بارش ہونے لگتی ہے، جب ان کا موضوع سخن حضورؐ کا چشمہ فیض ہوتا ہے ساغر دل چھلک جاتا ہے، جب یاد حبیبؐ کا چاند ان کے دل کے آنگن میں اترتا ہے تو شب ہجراں چمک چمک جاتی ہے، اور جب وہ اپنی شاعری میں حسن سرکارؐ کا مضمون باندھتے ہیں تو غنچہ فن چٹک چٹک جاتا ہے۔

ذرا آپ بھی ملاحظہ فرمائیں اس مرتبے کا شعر آپ کو کہاں ملے گا؟

عرش سے مژدہ بلقیس شفاعت لایا
طائر سدرہ نشیں مرغ سلیمان عرب

فاضل بریلویؒ کو علم نے نک چڑھا اور زہد نے سر پھرا نہیں بنایا کہ گردن اکڑی رہے اور چہرہ سکڑا رہے بلکہ ان کا لہجہ انکسار کا غماز اور سوز کا ترجمان ہے، کہتے ہیں،

ایک میں کیا مرے عصیاں کی حقیقت کتنی
مجھ سے سو لاکھ کو کافی ہے اشارہ تیرا
مفت پالا تھا کبھی کام کی عادت نہ پڑی
اب عمل پوچھتے ہیں لائے نکما تیرا
تیرے ٹکڑوں پہ پلے، غیر کی ٹھوکر پہ نہ ڈال
جھڑکیاں کھائیں کہاں چھوڑ کے صدقہ تیرا

فتاویٰ پر کام کرتے کرتے جب ان کے قلم سے یہ اشعار نکلتے ہیں تو

ان کی مہک نے دل کے غنچے کھلا دیئے ہیں
جس راہ چل دیئے ہیں، کوچے بسا دیئے ہیں
اک دل ہمارا کیا ہے، آزار اس کا کتنا
تم نے تو چلتے پھرتے مردے جلا دیئے ہیں
ان کے نثار کوئی کیسے ہی رنج میں ہو
جب یاد آ گئے ہیں سب غم بھلا دیئے ہیں

اس نعت کے سامنے تغزل کی اباحت شرمانے لگتی ہے، یہ اشعار ایک بار پڑھیے اور عمر بھر سر دھنیے۔

فاضل بریلویؒ کی یہ نعت تو نغمۂ زبور ہے چند شعر ملاحظہ ہوں:

حسن کھاتا ہے جس کے نمک کی قسم
وہ ملیح دل آرا ہمارا نبی ﷺ
کیا خبر کتنے تارے کھلے چھپ گئے
پر نہ ڈوبے نہ ڈوبا ہمارا نبی ﷺ

جس کی دو بوند ہیں، کوثر و سلسبیل
ہے وہ رحمت کا دریا ہمارا نبی ﷺ
جس کے تلووں کا دھوون ہے آبِ حیات
ہے وہ جان مسیحا ہمارا نبی ﷺ

میرا ایمان اور عقیدہ ہے کہ آج کے گتھم گتھا اور چھینا جھپٹ قسم کے دور میں عشق رسولؐ کی سوغات بانٹنے کی ضرورت ہے، آج امریکہ اور یورپ ہماری اس متاع کو لُوٹنے کی فکر میں ہے، کیونکہ اسے معلوم ہے کہ امت مسلمہ جب کبھی ڈوب ڈوب کر ابھرے گی، ٹوٹ ٹوٹ کر جڑے گی، گر گر کر اٹھے گی اور مر مر کے جئے گی تو عشق رسولؐ کے سہارے ہی ابھرے گی، ذات نبیؐ پر جڑے گی، نظام مصطفیٰ پر اٹھے گی اور یاد حبیبؐ سے جیئے گی۔

دولت درد اور متاع عشق کوئی معمولی چیز نہیں کہ جس کی حفاظت سے ہم غافل ہو جائیں، اس سے محرومی کا تلخ ذائقہ ہم یورپ سے پوچھیں، جس کے پاس سب کچھ ہے مگر اپنا آپ نہیں بچا، دل رہ گیا مگر دھڑکن نام کو نہیں، آنکھیں سلامت ہیں مگر نور سے خالی اور وجود باقی ہے مگر احساس سے محروم، آیئے ہم اپنی اس کمٹ مٹ کو حقیقت بنا دیں۔

☆☆☆☆

سید جمال الدین افغانیؒ اور اتحاد عالم اسلامی

اسلام کے حوالے سے جب ایک ملت محض روحانی، اخلاقی، نظریاتی اور دینی بنیادوں پر متشکل ہوگئی تو ایک نئی برادری دنیا کے سامنے آئی، اس برادری میں کسی ایک کی کسی دوسرے کے ساتھ کوئی ایک بھی مادی قدر مشترک نہیں، جو انہیں قوم یا قومیت بناتی ہو۔ لسانی، نسلی، علاقائی، وطنی، جغرافیائی، صوبائی، ملکی، براعظمی، تہذیبی، ثقافتی یا تاریخی اعتبار سے کوئی تیز ترین خوردبین کے ذریعے ایک رتی برابر بھی کوئی قدر مشترک ان میں نہیں ڈھونڈی جا سکتی، چنانچہ عملاً نوع انسانی کو وطنی، لسانی اور نسلی قیود کے پیدا کردہ تعصّبات سے بلند کر کے ایک برادری کے قالب میں ڈھال دینے کا شرف اسلام کو حاصل ہوا،

لیکن افسوس کہ مرور ایام کے ساتھ قرآن اور صاحب قرآنؐ کا دیا ہوا تصور ملت کتابوں میں تو موجود رہا لیکن عملاً مسلمانوں کا اتحاد انتشار ہیں، عروج زوال میں سیاسی اقتدار انحطاط میں اور آزادی غلامی میں بدلنے لگی، انیسویں اور بیسویں صدی تو خاص طور پر مسلمانوں کے لیے سیاسی و معاشی محکومی، انتشار اور زوال کا عروج ثابت ہوئی۔

لیکن اللہ تعالیٰ نے امت مسلمہ کی بے بسی، مایوسی اور بے چارگی (جو ان کے اپنے اعمال ہی کا نتیجہ تھی) کے دور میں بھی مسلمانوں کے ساتھ اپنے فضل و کرم کا خصوصی معاملہ فرمایا اور ان کو علامہ اقبالؒ اور حضرت سید جمال الدین افغانیؒ جیسی عظیم المرتبت اور مقتدر ہستیوں کا تحفہ عطا کیا جنہوں نے ملت اسلامیہ کے اندر پائے جانے

والے انتشار کو اتحاد، محکومی کو آزادی اور زوال کو عروج میں بدلنے اور انہیں عظمت رفتہ سے ہمکنار کرنے کے لیے اپنے شب روز وقف کر دیئے اور تا دم واپسیں اس عظیم مشن پر گامزن رہے۔ اور بیسویں صدی میں ایران کے ایک مرد قلندر آیتہ اللہ خمینیؒ نے ایران میں لاشرقیہ، لاغربیہ، لاشعیہ، لاسنیہ بنیادوں پر انقلاب برپا کر کے اپنے ان بزرگوں کے خواب کو عملی تعبیر بخش دی،

اللہ اور اس کے رسولؐ کے درس اتحاد کو دنیا بھر میں پھیلانے کے لیے عالم اسلام کی مقتدر شخصیت سید جمال الدین افغانیؒ زندگی بھر پارے کی طرح مضطرب رہے، اور انہوں نے قومیت و وطینت کی تنگیوں سے نکل کر پورے عالم اسلام کو اپنے پیغام اور خطاب کا موضوع بنایا۔

اس حیرت انگیز انسان کی سرگرمیاں عملاً پوری دنیا کے اسلامی اور یورپی ممالک پر بھی حاوی رہیں جن کی حکومتیں مسلمان قوموں کے معاملات سے سیاسی واسطہ رکھتی تھیں افغانستان، ایران، ترکی، مصر اور ہندوستان ان سب ممالک سے سید مرحوم کا قوت آموز ربط وضبط رہا اور یہ تمام خطے اس رابطے سے گہرے اور قریبی طور پر متاثر ہوئے ایران میں ملوکیت کے خلاف سیاسی سطح پر جو دھماکہ ہوا اور 1891ء میں اجارہ تمباکو کے خلاف شورش اپنے ابتدائی مراحل میں جناب سید کے مشورے اور حوصلہ افزائی سے برپا ہوئی۔ 1908ء میں نوجوان ترکوں کی کامیاب تحریک سید صاحب کی انقلاب آفریں شخصیت کے زیر اثر برپا ہوئی۔ جس کو انہوں نے اپنے قیام قسطنطنیہ کے دوران میں پروان چڑھایا تھا، مصری قوم پروروں کی وہ تحریک جو اپنے عنفوان شباب میں ''اعرابی بغاوت'' کے ناکام ہونے کے باعث خاموش ہوگئی۔ اس کے بنیادی محرک بھی ہمارے ممدوح سید جمال الدین افغانیؒ تھے، اور مصر میں جس ذہنی، علمی اور مذہبی بیداری کے علمبردار مفتی محمد عبدہ تھے وہ پوری علمی تحریک سید جمال الدین افغانیؒ کے زرخیز ذہن اور انقلابی مزاج کی ممنون احسان اور خوشہ چین تھی۔

یہ بات بلا مبالغہ اور بلا خوف تردید کہی جا سکتی ہے اور اس کے مضبوط تاریخی دلائل اور سیاسی شواہد موجود ہیں کہ قومی آزادی کی تمام تحریکیں اور یورپی اقوام کی مہم پروری کے خلاف جو ہنگامے برسوں تک مختلف علاقوں میں برپا رہے ان سب کا سر چشمہ داعی اتحاد عالم اسلامی سید جمال الدین افغانیؒ کی ذات تھی۔

علامہ رشید رضا کے بقول سید جمال الدین افغانیؒ کو ترکی خلافت عثمانی سے مرکزیت اسلام کے حوالے سے بے حد عقیدت تھی ان کا مقصد صرف یہ تھا کہ کسی مسلم طاقت کو اٹھا کر اس قابل بنائیں جو پوری دنیا میں اسلام کا نقطہ ماسکہ بن جائے۔ انہوں نے مصر سے اس فکر کا آغاز کیا، لیکن وہاں اندرونی اور بیرونی سازشوں کے باعث انہیں کامیابی حاصل نہ ہوسکی تو انہوں نے اپنی آرزوؤں کا مرکز سوڈان کی مہدی تحریک کو بنایا۔ پھر انہوں نے اس سلسلے میں ایران کا انتخاب کیا اور بالآخر عثمانی خلافت کی طرف متوجہ ہو گئے۔

سید جمال الدین افغانیؒ کی ہمہ جہت، انتھک اور مسلسل کوششوں کا سب سے بڑا مقصد یہ تھا کہ تمام مسلم اقوام ایک حکومت اسلامی کے تحت متحد ہو جائیں، جس طرح صدر اسلام کے پر افتخار دور میں ہوتا تھا۔ بعد میں اسلام کی متحدہ قوت متواتر اختلافات اور باہمی نزاعات سے منتشر ہو گئی اور مسلمان ملک اپنی جہالت، نادانی، بے بسی اور غیروں کی دسیسہ کاریوں کے باعث مغربی چیرہ دستی کا شکار ہو گئے مسلم اقوام و ممالک کی یہ بے بسی، انحطاط، زوال اور انتشار جناب سیدؒ کو خون کے آنسو رلاتا اور انہیں ہمیشہ دکھی اور غمگین بنائے رکھتا تھا، ان کا عقیدہ یہ تھا کہ اگر یہ ممالک ایک دفعہ بیرونی تسلط اور مداخلت کے بوجھ سے آزاد ہو جائیں اور اسلام کو ایک ہمہ گیر انقلابی قوت کے طور پر اپنا لیں تو مسلمان ممالک یورپی قوموں کے سہارے یا ان کی نقالی کئے بغیر اپنے لیے ایک جدید اور شاندار زندگی کا نظام تیار کر سکتے ہیں، ان کے نزدیک دین اسلام اپنے تمام لوازم میں ایک آفاقی مذہب ہے جو اپنی داخلی روحانی قوت کی وجہ سے یقینی طور پر

ایسی اہلیت رکھتا ہے کہ تمام بدلتے ہوئے حالات کا نہ صرف ساتھ دے سکتا، بلکہ اس کی رہنمائی کرسکتا ہے۔

سید جمال الدین افغانیؒ کی اس بے چینی، انہماک، اضطراب، دوڑ دھوپ، کاوش وکوشش اور حرکت وعمل کے پیچھے اسلام کے احیاء کی مخلصانہ خواہش کام کر رہی تھی، انہوں نے مسلمانوں کے عالمی اتحاد کے ابتدائی مرحلے کے طور پر شیعہ اور سنی ملکوں کو باہم رعائتوں اور مفاہمتوں کی بنیاد پر متحد کرنے کی بے حد کوشش کی۔

پروفیسر ای۔ جی براؤن نے سید صاحب کے متعلق لکھا ہے کہ ''وہ بے پناہ قوت کردار، وسیع علم وفضل، انتھک جوش عمل، بے نظیر جرات واستقامت اور تقریر وتحریر میں غیر معمولی فصاحت وبلاغت کے حامل تھے ان کا سراپا بھی انتہائی دلکش، وجیہ اور جاذب نظر تھا، وہ بیک وقت فلسفی، ادیب، خطیب اور صحافی تھے اور ان سے بھی اوپر بہت بڑے سیاستدان تھے۔ ان کے مداح انہیں بے حد محب وطن اور ان کے مخالفین انہیں خطرناک شورش پسند سمجھتے تھے''

مغربی اہل قلم نے سید جمال الدین افغانیؒ کی تحریک اتحاد اسلامی کو زیادہ تر مذمت کی خاطر ''پان اسلامزم'' کا نام دیا جب کہ اس تحریک کا مقصد تمام اسلامی حکومتوں کو ایک اسلامی ریاست کے جھنڈے تلے متحد ومنظّم کرنا تھا، تاکہ وہ استعمار کے تسلط سے نجات حاصل کرسکیں انہوں نے اپنے شہرآفاق مجلّہ ''العروہ الوثقیٰ'' میں اتحاد اسلامی کے عنوان سے ایک مضمون قلمبند کیا وہ لکھتے ہیں۔

''مسلمان کبھی ایک پر جلال سلطنت کے ماتحت متحد تھے، چنانچہ فلسفہ اور علم وفضل میں ان کے کارنامے آج تک تمام مسلمانان عالم کے لیے باعث فخر ہیں، مسلمانوں کا فرض ہے کہ ان تمام ممالک میں جو کبھی بھی اسلامی رہ چکے ہیں۔ اسلامی حکومت کے قیام اور استقلال کے لیے مل کر کوشش کریں، انہیں کسی حالت میں بھی ان طاقتوں سے جو اسلامی ممالک پر حصول اقتدار کے لیے کوشاں ہیں۔ اس وقت تک مصالحانہ رویہ

اختیار کرنا مطلق جائز نہیں جب تک کہ وہ ممالک بلا شرکت غیر کاملاً مسلمانوں کے قبضے میں نہ آجائیں"

جناب سیدؒ کے خیال میں مغربی اقوام مشرقی ثقافت کی نشوونما روکنے کے لیے بلکہ اس کے استیصال کے لیے مشرق میں جذبہ حب وطن کو دبانے کے لیے قومی تعلیم کا گلا گھونٹتی ہیں، وہ مشرقی اقوام کو ہر حیلے اور طریقے سے یہ باور کرانے کی کوشش کرتی ہیں کہ ان کا وطن ہر قسم کے کمالات اور خوبیوں سے عاری ہے وہ انہیں ترغیب دلاتی اور یہ ماننے پر آمادہ کرتی ہیں، کہ عربی فارسی اور دوسری قومی زبانوں میں کوئی قابل ذکر لٹریچر موجود نہیں، اور ان کی تاریخ میں کسی عظمت اور شان و شوکت کی علامات موجود نہیں، وہ انہیں یہ یقین دلانا چاہتی ہیں کہ ایک مشرقی باشندے کا سب سے بڑا کمال یہ ہے کہ وہ اپنی زبان کو ذریعہ ابلاغ بنانے سے گریز کرے اور وہ اس پر فخر کرے کہ وہ دوسروں بالخصوص مغرب کی زبان سے اپنا مافی الضمیر بہتر طور پر بیان کر سکتا ہے۔

سید جمال الدین افغانی مشرق جدید کی تاریخ میں آزادی ایشیا کے پہلے مجاہد تھے جن کی بصیرت نے ایک اسلامی بلاک کی ضرورت محسوس کی اور اسے امن عالم کی لازمی اور ناگزیر شرط ٹھہرایا، علامہ اقبالؒ نے بھی سید جمال الدین افغانیؒ کو زمانہ حال کے مسلمانوں کی نشاۃ ثانیہ کا موسس قرار دیا ہے۔

سید جمال الدین افغانیؒ کا میدان تگ و تاز مصر، ترکی، ایران اور ہندوستان تک پھیلا ہوا تھا سید جمال الدین افغانیؒ کو مرکزیت اسلام کے حوالے سے ترکی خلافت سے بہت زیادہ دلچسپی بلکہ عقیدت تھی اس لیے بعض لوگوں نے جناب سید کو ترکی سلطنت کا آلہ کار قرار دیا جو ترقی کا مخالف، علم و دانش کا مخالف، حب وطن کا مخالف اور نئی روشنی کا مخالف تھا، بنا بریں سید جمال الدین افغانیؒ کی تحریک اتحاد اسلامی کو ترکی ہی میں بڑی مزاحمت کا سامنا کرنا پڑا حالانکہ سید مرحوم قومی تحریکوں، اور وطنی آزادی کی تمام کوششوں کے حامی تھے البتہ مغربی طرز تمدن، ثقافت، تعلیم اور اس کے ذہنی غلبے اور تسلط کے

خلاف تھے، ان کے نزدیک آزادی کا مطلب ہر بندش اور اصول سے آزادی نہ تھا، اور ترقی کا مطلب اپنی شاندار روایات اور روشن ماضی سے انکار نہ تھا اور اس کے برعکس ماضی سے وابستگی کا مطلب حقائق سے آنکھیں چرانا بھی نہ تھا ان کا فلسفہ یہ تھا کہ خلافت اگرچہ متعدد پہلوؤں سے ازکار رفتہ ہوگئی ہے تاہم یہ ادارہ کسی نہ کسی شکل میں باقی رہ جائے تا کہ اس کھنڈر پر شوکت و وحدت اسلام کی نئی عمارت کھڑی کی جا سکے اگر سرے سے بنیاد ہی نہ رہی تو پھر سے اتحاد عالم اسلامی کار دشوار ہی نہیں کار محال بن جائے گا۔

ترکی میں مغربی تعلیم و تمدن سے متاثر لوگوں کی ایک کھیپ مقابلے کے لیے میدان میں اتر آئی۔ ان میں نامق کمال، ضیاء پاشا، اور مصطفیٰ فاضل پاشا خاص طور پر قابل ذکر ہیں، ان کے نزدیک عثمانی تہذیب ترکی تہذیب نہ تھی بلکہ ایرانی تہذیب کا چربہ تھی اور فارسی زبان دفتری اور خواص کی زبان تھی چنانچہ انہوں نے ”عربی تہذیب“ پر ”غربی تہذیب“ کو ترجیح دی، ادھر سید جمال الدین افغانیؒ کے ہم خیال لوگوں میں احمد فریس، شیخ ظفر مکی، شیخ فضل حضر موتی اور عبدالہدیٰ ایسے لوگ شامل تھے جو مشرق و مغرب، عربی اور عجمی کی تقسیم کے مقابلے میں ملت اسلامیہ کی مرکزیت اور اتحاد کے داعی تھے۔

ترکی قومیت کے علمبردار ترکوں کی باخواندگی اور پسماندگی کا ذمہ دار عربی رسم الخط اور مذہبی مراسم کو قرار دیتے تھے جب کہ سید صاحب اس زوال کو اسلام سے لاتعلق اور بے گانگی کا نتیجہ سمجھتے تھے۔

سید جمال الدین افغانی شام، لبنان، فلسطین، البانیہ، نجد، عراق اور یمن کی تحریکات آزادی کے مخالف نہ تھے بلکہ حامی اور موید تھے لیکن ان کی سوچ یہ تھی کہ استعمار سے آزادی کا مطلب ملت اسلامیہ کی وحدت پارہ پارہ کرنا نہیں ہونا چاہیے، کہ ان خطوں کے لوگ اپنی اپنی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد بنالیں، دوسری طرف ہندوستان، مصر،

سوڈان، لیبیا، الجزائر اور تیونس کے کروڑوں مسلمان جو برطانیہ، فرانس اور زارِ روس کے زیرِ نگیں تھے ان کی نظر میں سلطنت عثمانیہ لے دے کر ایک ہی آزاد مسلم مملکت تھی اس لیے ان کے ہاں اتحاد عالم اسلام کا تصور خاصا مقبول رہا اور سمجھتے تھے کہ استعمار کے مقابلے میں ترکی عثمانی خلافت کا ساتھ دیا جائے تا کہ کہیں استعمار ایک ایک کر کے ہر ایک کو ہڑپ نہ کر جائے۔

اتحاد عالم اسلامی کا نعرہ درحقیقت عالمی سامراج کی نئی حکمت عملیوں کے خلاف تھا کیوں کہ سامراج یہ سمجھتا تھا کہ مختلف ممالک اگر سیاسی اور جغرافیائی طور پر آزاد بھی ہو جائیں مگر کم از کم ذہنی اعتبار سے وہ پھر بھی اس کے غلام رہیں جبکہ اتحاد عالم اسلامی کے داعیوں کا خیال تھا کہ سامراج سے آزادی سیاسی اور وطنی بھی ہو اور ذہنی اور روحانی بھی! اور اس کی ایک شکل ہے کہ ملت اسلامیہ قومیتوں اور وطنوں میں بٹ کر نہ رہے بلکہ ایک مرکز سے وابستہ رہے تا کہ ہر طرح کے حملوں کی بھرپور مدافعت ہو سکے۔

اس دور میں ترکی سیاست کے تین رجحان تھے، اولاً، روائتی رجحان، ثانیاً، نسلی رجحان یہ لوگ نسلی بنیادوں پر ترکی کی تعمیر نو کرنا چاہتے تھے جس سے وسطی ایشیا اور مغربی ایران بھی ترکی کا حصہ بنتا تھا ثالثاً قوم پرستانہ رجحان یہ رجحان خاصا مزاحمتی اور طاقتور تھا، مگر جمال الدین افغانی ان تینوں کے مقابلے پر خالص اسلامی اور ملی رجحان کے نمائندے تھے۔

اگرچہ جمال الدین افغانیؒ کی کوششوں کا نتیجہ برصغیر میں یہ نکلا کہ یہاں تقسیم ہند یک قومی بنیادوں پر نہیں بلکہ دوقومی نظریے کی بنیاد پر ہوئی اور اسلامی آئیڈیالوجی پر مبنی مملکت، پاکستان وجود میں آئی، مصر اور ترکی قومیتوں کی راہ پر چل نکلے، لیکن سید جمال الدین افغانیؒ اور علامہ اقبالؒ کے خواب ابھی تک ادھورے ہیں کیونکہ مختلف اسلامی ممالک جغرافیائی اعتبار سے تو آزاد ہو گئے مگر ذہن کی زنجیریں توڑنے میں کامیاب نہ ہو سکے چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ مصر میں خود کو آل فرعون کے طور پر متعارف کرانے کی

مہم، ترکی میں جدیدیت اور لبرل ازم کی بے محابا تشہیر، اور پاکستان میں خود کو موہن جوداڑو کے کھنڈرات سے وابستہ کرنے کی تحریک اسی ذہنیت کی عکاس ہے کہ ہم یورپ کے پھیلائے ہوئے دام ہمرنگ زمین میں الجھ گئے، کچھ ممالک مغرب کے سرمایہ دارانہ بلاک سے منسلک ہو گئے اور کچھ نے اپنا رشتہ سوشلسٹ بلاک سے جوڑ لیا۔

یورپ چھوٹی قومیتوں اور رنگ ونسل کے امتیاز سے اپنے سفر کا آغاز کرتا ہے اور انٹرنیشنل ازم تک جا پہنچتا ہے اور مسلمان ممالک عالمگیر تصور ملت اور آفاقی نظریہ اخوت سے چلے اور محدود قومیتوں کے گرداب میں پھنس کر رہ گئے، ان حالات میں اسلامی برادری پر کچھ فرائض عائد ہوتے ہیں وہ ان کا احساس کر کے کسی متفقہ نتیجے پر اور لائحہ عمل پر پہنچ سکتی ہے۔

مصر نے اسرائیل سے کئی جنگیں لڑیں اور ان کی بنیاد عرب نیشنلزم کو بنایا۔ نتیجے میں سوائے تباہی اور شکست کے کچھ ہاتھ نہ آیا، ترکی اور حجاز کی مسئلہ خلافت پر ان بن کا نتیجہ یہ نکلا کہ ترکی کے سیکولر عناصر نے خود ہی آگے بڑھ کر قبائے خلافت چاک کر ڈالی اور یوں حجاز کو کچھ نہ ملا اور ترکی کے حصے میں محض ایک سیکولر حکومت اور یورپی معاشرت آئی، یمن کی باہمی رسہ کشی نے اسے مزید دو ٹکڑوں میں بانٹ کر ایک تو امریکہ اور دوسرے کو روس کی جھولی میں ڈال دیا، عالم عرب نے بیت المقدس کو صرف عرب کا مسئلہ بنا کر پیش کرنے کی کوشش کی تو اسرائیل کی تیس لاکھ آبادی دس کروڑ عربوں کے لیے نظریاتی، دفاعی اور جغرافیائی سطح پر ایک بہت بڑا چیلنج بن گئی۔

ان باہمی افتراقات اور تنازعات کا نتیجہ یہ نکلا کہ پورا عالم اسلام ایک چڑیا گھر کا نمونہ پیش کر رہا ہے۔ کہیں سوشلزم کا تجربہ ہو رہا ہے، کہیں سیکولر بنیادوں پر معاشرے کی تعمیر ہو رہی ہے، کہیں جمہوریت رائج ہے، کہیں آمریت کے مہیب سائے چھائے ہوئے ہیں کہیں از کار رفتہ ملوکیت اور بادشاہت کا سکہ رائج ہے، کہیں امیروں کا تسلط ہے، کہیں فوجی حکومتیں قائم ہیں الغرض جتنے مسلمان ملک ہیں اتنے ہی نظام رائج ہیں

اور یہ سارا شاخسانہ ہے اس عالمی سامراج کی ذہنی محکومی اور اس کے بے پناہ پروپیگنڈے کا کہ مسلمان قوم ایک ملت نہیں بلکہ مختلف قومیتوں کا مجموعہ ہے، افریقی، ایشیائی، عربی، عجمی، حجازی، ایرانی، بعید مشرقی، اور وسط شرقی، قومیں اور ان کی بھی اور ذیلی قسمیں، ہندوستانی، عراقی، ترکی، سوڈانی، بنگالی، افغانی، عربی قومیتیں وغیرہ، عالمی چالبازوں، سیاسی جغادریوں اور استعماری حیلہ طرازوں نے پوری دنیا کو قوموں کے خانوں میں بانٹ کر انہیں کمزور تر بنا دیا، مختلف ملکوں کے آزاد ہونے کے ساتھ ہی یا ایسی تحریکوں کے برپا ہوتے ہی لیگ آف نیشنز اور یونائنٹڈ نیشنز ایسے ادارے کھڑے کر دیئے کہ محکوم قومیں ایک جال سے نکلیں اور دوسرے پھندے میں پھنس جائیں تا کہ فیصلے کی قوت پھر بھی استعماری طاقتوں کے ہاتھ رہے، پوری دنیا کو چھوٹی چھوٹی ملکی اور قومی ٹکڑیوں میں بانٹ کر انہیں اقتصادی، نظریاتی، سیاسی، اور دفاعی طور پر کمزور بنا دیا اور عالمی اداروں میں طاقت کا توازن اپنے ہاتھ میں کرلیا، ویٹو پاور انہیں حاصل رہی جو پہلے استعماری طاقتیں تھیں۔ فرق یہ پڑا کہ پہلے طاقت ان کے فیصلے کا جواز تھی اور اب اخلاقی طور پر انہیں جواز ہاتھ آگیا، یہ فرانس، امریکہ، روس اور برطانیہ کس قانون، انصاف، ضابطے، اور ووٹ کی رو سے ویٹو پاور اپنے ہاتھ میں رکھنے کے اہل ہیں۔

قومی عصبیت کے حوالے سے یہودی مذہب، ہندومت، اور دوسرے مذاہب اس فلسفے کی پیداوار ہیں کہ اسرائیلی نسل میں یہودی ہو سکتے ہیں، ہندوستانی باشندہ ہی ہندو ہوسکتا ہے کوئی امریکی ہندو نہیں بن سکتا، کوئی دوسری قوم کا یہودی مذہب میں داخل نہیں ہوسکتا، اسلام تو اس معاملے میں آفاقی، عالمگیری، اور جہانی سوچ رکھتا ہے کوئی قریشی ہو یا بدو، کوئی عربی ہو یا ایرانی، کوئی ہندوستانی ہو یا افریقی، کوئی گورا ہو یا کالا، کوئی براعظم یورپ کا ہو یا براعظم ایشیا کا، کوئی مشرق بعید کا ہو یا مشرق وسطیٰ کا، کوئی بلوچ ہو یا پٹھان، کوئی فرانسیسی ہو یا پرتگالی ہر ایک ملت اسلامیہ کا فرد اور رکن بن سکتا ہے لیکن بڑی باریکی، چابکدستی اور فنکاری کے ساتھ مسلمانوں کے درمیان بعد اور

اجنبیت کی دیواریں حائل کر دی گئیں، اور انہیں باور کرانے کی پوری کوشش کی گئی، کہ فلسطین عالم عرب کا مسئلہ ہے، کشمیر پاکستان کا مسئلہ ہے، قبرص ترکی کا مسئلہ ہے، بیت المقدس مصر کا مسئلہ ہے، ایتھوپیا افریقہ کا مسئلہ ہے وغیرہ وغیرہ۔

اگر ہم بتعمق نظر دیکھیں تو جتنے روشن امکانات ملت اسلامیہ کے اتحاد اور نشاۃ ثانیہ کے ہیں اتنے دنیا کی کسی دوسری قوم کے نہیں، استعمار کی بین الاقوامی سازشوں اور حکمت عملیوں کے سبب امت مسلمہ میں پیدا ہونے والے افتراق اور برپا ہونے والے انتشار کے باوجود اس متفرق اور منتشر امت کو پھر سے پیکر ملت بنانے کی ٹھوس وجوہ مضبوط بنیادیں اور موثر عوامل اب بھی موجود ہیں۔

دور حاضر کی پیچیدگیاں اور فنی موشگافیاں اپنی جگہ پر اہم ہیں لیکن اگر جوہر اور بنیاد موجود ہو تو اوپری سطح کے اختلافات کسی معقول حکمت عملی کے ساتھ حل ہو سکتے ہیں۔

حالانکہ عرب اور عجم یہ آج نہیں بنے، خلافت راشدہ کے دور میں بھی تھے، اس کے بعد موجود رہے، یہ اختلاف رنگ ونسل خلافت عثمانی کے دور میں بھی تھا، یہ زبان کا مسئلہ بنو عباس کے عہد میں بھی موجود تھا، اگر اس وقت یہ رکاوٹیں آڑے نہ آئیں تو آج یہ مہیب عفریت بن کر ہمارا راستہ کیوں روکے کھڑی ہیں؟

کتنے ایسے آثار ہیں جو ہزار ہا میلوں کے فاصلوں کے باوجود ہر مسلمان ملک میں نظر آتے ہیں ماہ رمضان کے روزے پوری دنیائے اسلام حتیٰ کہ جہاں چند سو مسلمان کسی غیر ملک میں بستے ہیں وہاں بھی رکھتے ہیں، نماز اسی شکل وصورت میں پوری مسلم سوسائٹی میں ادا کی جاتی ہے، حج ہر سال ہر ملک کے مسلمان مل جل کر کرتے ہیں اور سب کو خدا کے گھر حاضر ہونا پڑتا ہے، کوئی گھر بیٹھ کر فریضہ حج ادا نہیں کر سکتا، ان آثار و شعائر سے اتحاد عالم اسلامی کی ایک سادہ شکل ہمارے سامنے آتی ہے کہ پیش نماز کوئی بھی ہو سب مسلمان اس کی اقتداء میں کھڑے ہو جاتے ہیں، خطبہ حج کے لیے کوئی سا امام اور خطیب ہو میدان عرفات میں سارے مسلمان اسے سنتے ہیں جب وہاں یہ

اختلاف قوم و وطن اور امتیاز من و تو اٹھ جاتا ہے تو اسے پھیلا کر دیکھنے سے یہ اختلاف کیسے فولاد کے بن جاتے ہیں جو کسی صورت کاٹے نہیں کٹتے۔

اس تجزیے کے بعد اب ہم متعین طور پر ان عملی تجاویز کا ذکر کریں گے، جن سے قومیت کے فلسفے کی پیدا کردہ مشکلات حل ہو سکتی ہیں اور پھر سے مسلمان مشق خاک بازی چھوڑ کر اندیشہ افلاکی کے خوگر بن سکتے ہیں۔

فلسفہ قومیت کے اثرات سے پہنچنے والے نقصان کے دو موٹے اور اہم نمونے سامنے آتے ہیں۔

1۔ گزشتہ پچاس سال کے اندر اندر تمام مسلمان ملک پنجہ غیر سے گلو خلاصی کرانے میں کامیاب ہو گئے مگر آزادی کے دن سے آج تک جو مسائل پیدا ہوئے وہ جوں کے توں ہیں، خواہ ان کا تعلق اندرونی سیاست، معیشت اور دیگر پالیسیوں سے ہو یا خارجی طور پر وہ مسائل درپیش ہیں، اگر کسی ملک کے باشندوں میں زبان کا مسئلہ ہے تو ہو جوں کا توں ہے، کسی ملک سے سرحدی تنازعہ تھا تو وہ اب تک حل ہونے بغیر چلا آ رہا ہے، اگر داخلی خود مختاری کا سوال اٹھا تھا تو ہنوز لاینحل ہے، مسئلہ فلسطین کو قومی تعصب کے ساتھ حل کرنے کی متعدد بار کوششیں ہوئیں مگر تا حال ناکامی ہی مقدر ٹھہری ہے، برصغیر کا مسئلہ کشمیر ہنوز حل طلب ہے، بیت المقدس کی آزادی تشنہ تعبیر خواب کی حیثیت رکھتی ہے، لبنان کی آبادی کا باہمی اختلاف برسوں سے خاک و خون کی نذر ہے، یہ تو وہ ابھرے ہوئے اور چیدہ مسائل ہیں جو زیادہ تر داخلی اور اندرونی نوعیت کے ہیں۔

2۔ سب سے بڑا مسئلہ اور بین الاقوامی سطح پر وقار اور عزت کا مسئلہ یہ ہے کہ اقوام متحدہ کے لگ بھگ پونے دو سو ارکان ممالک میں پچاس مسلمان ممالک ہیں، ان ممالک کے مسلمان باشندون کی کل آبادی سو کروڑ سے متجاوز ہے، لیکن بایں ہمہ سات کروڑ آبادی کے ملک برطانیہ، چند کروڑ آبادی کے روس پچیس کروڑ آبادی کے امریکہ، پانچ کروڑ آبادی کے فرانس کو تو ویٹو پاور حاصل ہے مگر سو کروڑ مسلمان کسی گنتی میں نہیں

اور یہ نتیجہ ہے فرد فرد اور لخت لخت ہونے کا! کہا جا سکتا ہے کہ سو کروڑ اکٹھے تو نہیں تو پھر انہیں اس حساب سے کیوں دیکھا جائے؟ اس کا معقول اور قابل عمل جواب یہی ہے کہ کم از کم جس مسئلہ پر تمام مسلمان ملک متفق ہوں اس پر تو انہیں ویٹو پاور کا حق ملنا چاہیے، لیکن:

ہے جرم ضعیفی کی سزا مرگ مفاجات

ابھی تک یہ بھی معلوم نہیں کہ ویٹو پاور کے استحقاق کا معیار اور بنیاد کیا ہے ماسوائے اس دور وحشت کی یادگار اور روایت کے کہ "جس کی لاٹھی اس کی بھینس"۔

اسی حصے بخرے ہونے اور خود کو اپنی ہی کسی نظریاتی، روحانی، اخلاقی، اور دینی لڑی میں پرونے کے بجائے دوسروں سے وابستہ ہونے کا نتیجہ ہے کہ مسلم لیڈر شپ ابھی تک بعض ذہنی تحفظات کے چنگل سے آزاد نہیں ہو سکی، شرق اور غرب کے بلاکوں سے وابستگی ہی کا ثمر ہے کہ افغانستان کے مسئلہ پر عالم اسلام کی ایک سے زیادہ رائیں ہیں، مسئلہ فلسطین پر یکسوئی کا فقدان ہے، مسئلہ کشمیر اسلامی برادری کی عدم یکجہتی کا اسیر چلا آ رہا ہے۔

القدس کی آزادی پر عالم اسلام کے ظاہری طور پر اتفاق کے باوجود باطنی کیفیت جدا جدا ہے، اسی باعث یہ سارے مسائل ہماری بہترین دماغی صلاحیتیں، ترقیاتی سکیمیں، معاشی اور سیاسی استحکام کے منصوبوں کا بہت زیادہ وقت لے رہے ہیں، اور ہم افرادی قوت، مالی وسائل، اور مملکتی طاقت رکھنے کے باوجود کمزور سے کمزور تر ہوتے جا رہے ہیں۔

تیل ہمارا مگر زندگی یورپ کی روشن اور رواں دواں، خام مال ہمارا مگر کام یورپ کی فیکٹریوں سے آ رہا ہے، افراد کار ہمارے مگر ان کے دماغ، صلاحیتیں اور قوت کارکردگی یورپ کے پاس گروی رکھی ہوئی ہے، سرمایہ ہمارا مگر تجوریاں یورپ کی بھری ہوئیں اور بینک اس کے چل رہے ہیں۔

موجودہ حالات میں اتحاد عالم اسلامی محض رضا کارانہ بنیادوں اور غیر سرکاری تنظیموں اور تحریکوں کے ذریعے ممکن نہیں بلکہ اس کے پیچھے ٹھوس سیاسی منصوبہ بندی، معاشی حکمت عملی اور گہری اسلامی سوچ کارفرما ہونی چاہیے۔

اب تک متعدد اور مختلف مقامات پر اسلامی سربراہ کانفرنسیں منعقد ہو چکی ہیں، رباط، طائف، لاہور، اور کاسا بلانکا میں عالم اسلام کے زعماء اکٹھے ہوئے کچھ سطحی فیصلے تو ہوئے مگر پائیدار نظم و ضبط اور منظم قوت سامنے نہیں آئی، اور پھر ان کانفرنسوں میں باہمی اختلافات کا جوار بھاٹا ابھرتا رہا اور ان میں دو مستقل کیمپ دکھائی دیتے رہے یہی وجہ ہے کہ اسلامی کانفرنس ایسا عالمی سربراہی ادارہ دنیا کے سامنے قابل رشک نمونہ پیش نہیں کر سکا، لگتا ہے کہ مختلف مسلمان ملکوں کے سربراہ اپنے تمام فیصلے خود مختارانہ اور آزادانہ بنیادوں پر نہیں کرتے یا کر ہی نہیں سکتے وہ ہمیشہ کسی نہ کسی ذہنی تحفظ کا شکار رہتے ہیں جو انہیں کسی ٹھوس اور واضح اور دوٹوک نتیجے پر پہنچنے سے قاصر رکھتا ہے۔

عالم اسلام کو درپیش اس سنگین صورت حال میں آج پھر سید جمال الدین افغانیؒ کی تحریک کو زندہ اور متحریک کرنے کی شدت سے ضرورت ہے اس کے لیے ایک طرف تو ہمیں ظالم طاغوتی قوتوں سے لڑنا ہوگا اور دوسری طرف ان مسلمانوں کے خلاف بھی اعلانِ جنگ کرنا ہوگا جو ان کا ظلم سہتے ہیں کیونکہ سید جمال الدین افغانیؒ کا دیا ہوا سبق ہے کیونکہ وہ جہاں ایران میں پائی جانے والی ملوکیت کہ ظلم کے خلاف تھے وہاں وہ ان لوگوں کو بھی غصے کی نظر سے دیکھتے تھے جو ملوکیت کا ظلم سہتے تھے۔ انہوں نے ایک دفعہ شاہ عبدالعظیم کی درسگاہ میں تقریر کرتے ہوئے فرمایا تھا ”من با ظالم و مظلوم ہر دو عداوت دارم۔ ظالم را برائے ظلمش دشمن دارم و مظلوم را برائے ایں کہ ظلم قبول می کند و سبب جسارت ظلم ظالم می شود۔“

☆☆☆☆

حیران کر دینے والی شخصیت

دنیا میں ہمیشہ دو طرح کے لوگ رہے ہیں، ایک وہ جو ''تاجور'' کہلاتے ہیں اور دوسرے وہ جو ''دیدہ ور'' ہوتے ہیں، دونوں میں فرق یہ ہے کہ تاجور گردش زمانہ کی نذر ہو گئے ہیں اور دیدہ ور مر کر بھی امر بن گئے ہیں، دنیا کے کسی وقت جن کے سروں پر تاج دیکھے تھے آج ان کی قبروں کی خاک اڑ رہی ہے، اور جو دامن چاک نظر آتے تھے ان کے نام کی گونج فلک الافلاک پر سنائی دیتی ہے، جو عالیشان مقبروں کے مکین ہیں وہ تنہائی کی آکاس بیل میں لپٹے ہوئے ہیں اور جو کچی لحد میں اتارے گئے ان کے چرچے ہر سو پھیلے ہوئے ہیں، جو کبھی چوبداروں کے جلو میں نکلا کرتے تھے وہ ہمیشہ کے لیے لوگوں کے حافظے سے نکل چکے ہیں اور جو کٹیا کے گوشے میں پڑے رہتے تھے آج دنیا ان سے جڑے رہنے میں فخر محسوس کرتی ہے، جن کی پیشانی نازک کی گرہ اوراق حکومت پہ شکن ڈال دیتی تھی۔ تاریخ نے ان پر گمنامی کا کفن ڈال دیا ہے اور جن کی جبیں نیاز میں سجدے تڑپتے تھے آج ان کی چوکھٹ پر شاہان وقت کھیاں رگڑتے ہیں، تخت زر نگار پر فروکش وقت کے دھارے میں خار و خس بن کر بہہ گئے ہیں اور بوریا نشین لوح زمانہ پر ثبت ہو کر رہ گئے ہیں۔

تاج زر اور خرقہ فقر کی عجیب داستان ہے، تخت کے موتی اور تاج کے ہیرے وہ کچھ نہ دے سکے جو بیاباں کے ذرّوں نے عالم انسانی کو عطا کیا ہے، یہ منظر تاریخ نے بار بار دیکھا کہ قصر مرکز سے نگاہیں کٹیا کی طرف اٹھیں مگر ایسا ہرگز نہیں ہوا کہ جھونپڑی

کی درز سے کبھی نظروں نے فلک بوس محلات کا طواف کیا ہو، یہ نظارہ تو ہزاروں لوگوں نے دیکھا کہ مرمریں محل سے اکتا کر شاہان وقت گھاس پھونس کی جھونپڑی میں آ کر عافیت کے طالب ہوئے مگر اس کا ایک بھی گواہ نہیں کہ کسی بوریا نشین نے شاہوں کی چوکھٹ پر سر نیاز جھکایا ہو اور وارثان جمشید و فریدوں تو تاج و تخت سے اکتا گئے مگر بوذرؓ و سلمانؓ کے جانشین اپنی گلیم فقر سے کبھی دل برداشتہ نہ ہوئے۔ تاریخ نے شاہوں کو خانقاہوں میں آتے دیکھا لیکن گداؤں کو کجکلاہوں کے پاس جاتے نہیں دیکھا، امیروں کو اطلس و کم خواب چبھنے لگے لیکن فقیروں کو کھدر کے چیتھڑے راس آ گئے، کلاہ خسروی کسی کو اتنا عالی دماغ نہ بنا سکا جتنا کہ دونی کی ٹوپی نے کر دیا، سکندر گھڑی گھڑی بدلتے رہے مگر قلندر جہاں تھے وہیں رہے، سکندر کو تاج و تخت سیر چشمی نہ دے سکا مگر قلندر کو فقر نے تونگر بنا دیا۔

کیچ مکران کا گورنر حاکم شاہ (م 1368ء) حضرت شاہ رکن عالم ملتانیؒ کا مرید بنا، گورنری چھوڑ کر گدڑی پہن لی، اوچ اور سکھر کا درمیانی علاقہ آپ کا تبلیغی مرکز بنا اور ہزاروں لوگوں نے فیض پایا۔

آج جس حیران کر دینے والی شخصیت کا ذکر حاصل محفل ہے یہ بھی اسی قبیلے کے فرد ہیں، جس قبیلے نے خاک تو چھانی ہے مگر نفس شریر کی بات نہیں مانی۔ گورنری کو لات ماری ہے مگر مقدر کی بازی نہیں ہاری، تخت حکومت کو چھوڑا ہے مگر اللہ سے منہ نہیں موڑا، حضرت محدث کچھوچھویؒ کے جد امجد حضرت سید جہانگیر اشرف سمنانیؒ شیراز کے گورنر تھے، جب 808ھ میں وفات پائی تو ایک زمانے کے مرشد و رہبر تھے۔

حضرت محدث کچھوچھویؒ اس میراث کے حامل تھے، اور مقام شکر ہے کہ انہوں نے بزرگوں کی میراث کی لاج نبھائی ہے، اور اپنے آپ کو زندہ جاوید کر لیا ہے۔

قسیم فیض ازل سے حضر محدثؒ کو یک رنگ بننے کا یہ صلہ عطا کیا کہ ہمہ رنگ شخصیت بنا دیا، وہ ایک در کے ہو رہے اللہ نے انہیں ہر دروازے سے بے نیاز کر دیا،

انہوں نے دل ونگاہ کو یکسو کیا قدرت نے ہر میدان میں سرخرو کر دیا، انہوں نے خود کو بازار عشق میں نیلام کیا حق تعالیٰ نے انہیں نیک نام کر دیا، وہ محدث تھے، مفتی اعظم تھے، فقیہ تھے، مفسّر تھے، مرشد تھے، متبحر عالم تھے، اور اپنے دور کے با اصول اور غیرت مند سیاستدان تھے، میں جب انکی شخصیت کے یہ پرتو دیکھتا ہوں تو اس وقت حیرت میں ڈوب جاتا ہوں جب وہ مجھے سلجھے ہوئے خطیب، نغز گو شاعر اور صاحب اسلوب انشاء پرداز بھی دکھائی دیتے ہیں، محدث وہ ہوتا ہے جو کانٹے کی تول تولے اور مفتی وہ ہوتا ہے جو قانون کی زبان بولے، فقیہ وہ جو مسئلہ سمجھائے اور مفسر وہ جو قرآن کی منشا بتلائے، عالم راہ دکھلاتا ہے، اور مرشد منزل پر پہنچاتا ہے، یہ سب کام جس نے اپنے ذمے لے رکھے ہوں اس کے لیے بہت مشکل ہے کہ وہ خطابت کے کوچے سے گزرے، شاعری کی گھاٹی میں اترے اور ادب و انشاء کی وادی طے کرے، مگر حضرت کچھوچھویؒ خطابت کے کوچے سے گزرے ہی نہیں اس کوچے کا ہر قدم یادگار بنا دیا ہے، شاعری نہیں کی بلکہ جادوگری کی ہے، ادب و انشاء کے میدان میں صرف پڑاؤ ہی نہیں ڈالا اپنا جھنڈا گاڑا ہے۔

محدث اعظمؒ کی خطابت کا رنگ دیکھنا ہو تو ''بنارس سنی کانفرنس'' سے خطاب کا نمونہ دیکھ لیا جائے، یہ آہنگ قابل دید ہے۔

''دنیا کو ہمیشہ یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ جس طبقہ نے عالمگیر و جہانگیر کی تلواروں پر حکومت کی، عباسیوں کی جلالت پر اپنے اقتدار کا پرچم لہرایا یعنی علماء حق، وہ نہ کسی مغرور کے دبائے دبتے ہیں نہ کسی شکی وہمی سے الجھتے ہیں، نہ کسی بدزبان اور بے لگام کو پرکاہ کے برابر سمجھتے ہیں وہ صرف اپنے خدا سے ڈرتے ہیں حق گو ہیں، حق پرست ہیں اور صرف حق کا اقتدار چاہتے ہیں''

آپ کا حسن انشاء بھی دامن نظر کھینچتا ہے، ایک عبا پوش اور عمامہ بسر عالم کا سواد تحریر دیکھیں۔

"اللہ تعالیٰ کا ہزاروں شکر ہے کہ ہم نے مرنے سے پہلے آپ حضرات کو ایک مقام پر جمع کر دیا نہ ہم میزبان ہیں اور نہ آپ مہمان! بلکہ ہم جاں بلب ہیں اور آپ مسیحا دم ہیں، آپ ہماری کراہ سے نہ گھبرائیں، آپ ہماری بے چینی سے چین بہ جبیں نہ ہوں، ہم آپ کی خاطر کیا کر سکتے ہیں ہمارے پاس کھلانے کو روٹی کا ایک سوکھا ٹکڑا بھی نہیں ہم آپ کو کہاں ٹھہرائیں؟ ہمارے پاس تو پھونس کا چھپر بھی نہیں اگر آپ پسند فرمائیں تو آپ کو ٹھہرانے کے لیے ہمارے خانہ دل کی ویرانیاں ہیں اور آپ کی خاطر کے لیے جان حاضر ہے، جگر حاضر اور پوری ذمہ داری سے کہتا ہوں کہ سر حاضر ہے"

اوپر کے الفاظ آپ کے اس لکھے ہوئے خطبے کے ہیں جو "آل انڈیا بنارس سنی کانفرنس" میں شریک علماء اور مشائخ کی خدمت میں خطبہ استقبالیہ پیش کیا تھا۔

عام طور پر یہ بات کہی جاتی ہے کہ مذہبی لوگ سنکی ہوتے ہیں حس لطیف ان کو چھو کر نہیں گزری، مفتی صاحبان ایک طوفان ہوتے ہیں، خوش ذوقی فتووں کی لہر میں بہہ جاتی ہے، محدث اور فقیہ بہت سنجیدہ ہوتے ہیں اس لیے شعر و ادب ان سے رنجیدہ ہوتے ہیں، علماء کی بھویں ہر وقت تنی رہتی ہیں، اس لیے فنون لطیفہ سے ان کی ہر لمحہ ٹھنی رہتی ہے، مگر جب ہم اپنے وقت کے عظیم محدث، فقیہ، عالم اور شیخ سے ملتے ہیں تو خوشگوار حیرت ہوتی ہے کہ وہ عمر بھر حدیث پڑھاتے رہے اور ساتھ ساتھ ادب و انشاء کے جام لنڈھاتے رہے، لوگوں کو فقہی مسائل بتاتے رہے اور پہلو بہ پہلو شاعری کے موتی لٹاتے رہے، ان کو تفقہ میں مہارت تھی تو ان کی تغزل میں نفاست تھی، مسند ارشاد پر صوفی نظر آتے تھے تو بزم شعر میں قدسی و عرفی دکھائی دیتے تھے ان کی غزل کے چند اشعار سنیئے اور سر دھنیئے!

اللہ رے شان گلشن زہراؓ کے پھول کی
کرب و بلا کو رشک گلستان بنا دیا
حسن ملیح یار کی لذت نہ پوچھیئے

زخم جگر کو میرے نمک داں بنا دیا
دستور عشق ہے کہ ابھرتے ہیں ڈوب کر
یوسف کو چاہ نے مہ کنعان بنا دیا
میری سیاہ بختی پہ جب رحم آ گیا
کملی کو اپنی شمع شبستان بنا دیا

ایک چھوٹی بحر کی غزل بھی ملاحظہ کیجئے، چھوٹی بحر میں بڑے شعر یوں ہوتے ہیں۔

پہلے پتھر کا کلیجہ کیجئے
عشق کا پھر آپ دعویٰ کیجئے
اپنے ماروں کو تو زندہ کیجئے
پھر مسیحائی کا دعویٰ کیجئے
عاقلی دانائی و فرزانگی
ان کے دیوانوں سے سیکھا کیجئے
طاق ابرو ہے کہ محراب حرم
جی میں آتا ہے کہ سجدہ کیجئے

حضرت محدّث کچھوچھویؒ نے ایک غزل میں یہ مضمون بھی باندھا ہے اور کتنا موزوں باندھا ہے۔

لگ گئی ہے عقل کی دنیا میں آگ
کیا ادھر لرزی کسی کی آہ عشق
پوچھنا ہے پوچھ لو فرہاد سے
کوہ سے کتنا گراں ہے کاہ عشق

یوں تو ساری زمین اللہ کی ہے، اور بہت بڑی نعمت ہے لیکن کچھ لوگوں کا وجود اس

زمین کا سرمایۂ عزت ہے، یہ زمین کی تہہ ذرّوں کا ایک مجموعہ ہے لیکن بزرگوں کے قدم لگنے سے یہ ذرّے آفتاب بن گئے ہیں، لاہور میں سلطان قطب الدین ایبک اور شہنشاہ جہانگیر آسودہ خاک ہیں، مگر لاہور کا اصل شرف یہ ہے کہ وہ ''داتا کی نگری'' ہے پاک پتن ایک ویرانہ تھا مگر بابا فریدؒ نے اسے انداز شاہانہ عطا کر دیا ہے، دلی میں شہنشاہ ہند نصیر الدین ہمایوں کی قبر ہے مگر دلی کو دل والوں کا مرکز نگاہ خواجہ نظام الدین دہلویؒ نے بنایا ہوا ہے، ہزاروں شہروں میں ایک شہر سرہند ہے مگر شیخ مجددؒ نے اسے سر بلند کر دیا، ملتان کسی دور میں بلاشبہ دارالحکومت رہا مگر شیخ بہاؤ الدین زکریاؒ نے اسے اپنا مسکن بنا کر ہم پایۂ آسمان کر دیا، اسی طرح کچھوچھہ ایک قصبہ تھا مگر سمنان کے مسافر نے اسے روحانیت کا سرچشمہ بنا دیا اسی چشمے کے ایک گھونٹ نے محدث اعظمؒ کو حیات جاوداں بخش دی۔

جلا سکتی ہے شمع کشتہ کو موج نفس ان کی
الٰہی! کیا چھپا ہوتا ہے اہل دل کے سینوں میں

☆☆☆☆

"جنید وقت"

اقبالؒ نے کہا ہے:

جلا سکتی ہے شمعِ کشتہ کو موجِ نفس ان کی
الٰہی ، کیا چھپا ہوتا ہے اہل دل کے سینوں میں

واقعہ یہ ہے کہ انہی اہل دل کے دم قدم سے رنگ محفل ابھی تک پھیکا نہیں پڑا، ورنہ ہر دور کے چنگیز اور ہلاکو نے اس بزم رنگ و بو کر درہم برہم کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی، بڑے بڑے کج کلاہ یہاں کم نگاہ ملے، تاجور غارتگر نکلے، نامور اور معتبر بے ہنر ثابت ہوئے، تاجدار ناہنجار نظر آئے، ارباب تخت و تاج دوسروں کے محتاج دکھائی دیئے، دلدادگان شوکت و جاہ اسیرِ کمندِ ہوا معلوم ہوئے، صاحبان کروفر بندگان سیم و زر محسوس ہوئے، لیکن یہ اللہ والے ہیں جو گلیوں کی خاک پھانکتے مگر لوگوں میں درد بانٹتے رہے، فرش خاک پر بیٹھ کر عرش پاک کی خبریں دیتے رہے، شان بے نیازی کے ساتھ عہد سازی کرتے رہے، ان کی ادائے قلندری کے سامنے جلال سکندری ماند رہا، ان کی خانقاہوں کے کچے آنگن میں بہار گلشن کا سماں رہا، یہ لوگ بظاہر خاک نشین تھے مگر حقیقت میں ہمسایہ جبریل امین تھے، ان کو دنیا کے کسی دربار میں جگہ نہیں ملی لیکن ان کے ہاتھوں بڑے کردار تخلیق ہوئے، یہ لوگ ہمیشہ آبلہ پا رہے لیکن داستان وفا رقم کرتے رہے۔ اہل دنیا لعل و گہر سمیٹتے رہے، یہ لوگ دیدہ ور پیدا کرتے رہے، بادشاہوں نے تیغ و تبر سے کام لیا، یہ لوگ نگاہ کیمیا اثر سے کام کرتے رہے، جو کام لشکر و

سپاہ سے نہ ہو سکا وہ معجزہ ان مردان حق آگاہ نے کر دکھایا، اہل مدرسہ کتابوں میں گم رہے یہ لوگ دلوں میں اتر گئے، دارا و سکندر بالآخر مٹ گئے مگر یہ لوگ صفحہ ہستی پر مثبت ہو گئے، آندھیاں ان کے چراغوں کو نہ بجھا سکیں، اور دنیا کی کروٹیں ان کا نام نہ مٹا سکیں، گردش ایام کے ہاتھوں کئی تخت گر گئے، کتنے تاج اچھل گئے، بے شمار سلسلے بکھر گئے، لیکن سچی بات یہ ہے کہ وقت کے ساتھ ساتھ یہ لوگ مٹنے کے بجائے اور نکھر گئے، جوں جوں گرد حوادث کی تہہ اترتی جائے گی ان لوگوں کی شخصیت ابھرتی آئے گی۔ مقام حیرت ہے کہ شاہی خاندان بے نام ونشان ہو کر رہ گئے ہیں، انھوں نے اپنا سر اونچا رکھنے کے لیے نجانے کتنی گردنوں کو بزور شمشیر جھکایا، اپنا گھر بھرنے کے لیے بے شمار شہر اجاڑے، اپنی راحت کے لیے کتنوں کو مبتلائے اذّیت کیا، اپنی عزت کی خاطر دوسروں کی ذلت کا سامان کیا، اپنی بقا کے لیے قبیلے فنا کیے، حصول تاج کے لیے کئی ملک تاراج کیے اپنی خود نمائی کے لیے دوسروں کی رسوائی کا اہتمام کیا، ذاتی آسائش کے لیے ہزاروں کو آزمائش میں ڈالا، ذاتی وقار اور جھوٹے پندار کے لیے مخلوق خدا کو آزار پہنچایا، نام ونمود کے لیے بستیوں کو نیست و نابود کیا، شاہوں کے یہ جتن پھر بھی ان کے کام نہ آئے، البتہ وہ خود تاریخ کے کوڑا دان کے کام آ گئے۔ اور اپنے پیچھے عبرت کی کئی داستانیں چھوڑ گئے، جلے ہوئے کھیت، ٹوٹے ہوئے محل، بکھرے ہوئے تاج، الٹے ہوئے تخت، پھٹی ہوئی مسند، روتے ہوئے یتیم بچّے، آئیں بھرتی بیوائیں، بددعائیں دیتی مخلوق، زخم سہلاتی رعایا، اور کراہتی چیختی انسانیت، بادشاہوں کی یادگار ہے۔

جب اہل اللہ پر نظر پڑتی ہے تو ان کا چہرہ روشن نظر آتا ہے، ان کی پیشانی پر آثار عبادت تو نظر آتے ہیں نشان ملامت ہرگز نہیں، دل میں درد کے چراغ تو فروزاں ہوتے ہیں، ندامت کے داغ نمایاں نہیں، دامن پر فقر کے پیوند تو موجود ہیں گدائی کا کوئی دھبہ نہیں ہے، ان کے گیسو منتشر ہوتے ہیں مگر دل وضمیر صد فیصد مطمئن، پیٹ

خالی رکھتے ہیں لیکن کسی کے سوالی نہیں بنتے، برہنہ سر تو ہوتے ہیں کسی کے دست نگر نہیں بنتے، پگڈنڈیوں پر چلتے ہوئے جنت کی روشوں کا لطف اٹھاتے ہیں، دنیا ان سے لاکھ منہ موڑے مگر وہ کسی کا دل نہیں توڑتے، صوفیاء اپنے پیچھے قلعے چھوڑ کر نہیں جاتے خوبصورت روبے چھوڑ کر جاتے ہیں ان کی وراثت درہم و دینار نہیں حسن اخلاق و کردار ہے، ان کا ترکہ باغات و محلات نہیں قابل تقلید فضائل و عادات ہیں، یہ لوگ کتنے دلوں میں خوف خدا بھر گئے، کتنی آنکھوں کو معرفت کی چمک دے گئے، کتنے ذہنوں میں احساس جوابدہی اجاگر کر گئے، کتنے ہاتھوں کو مصروف دعا کر گئے۔ کتنی زبانوں کو وقف ذکر کر گئے۔ کتنے ماتھوں کو آشنائے سجدہ کر گئے۔ کتنے سینوں میں شمع عشق روشن کر گئے، اور کتنی سوچوں کو پاکیزگی اور کتنی روحوں کو بالیدگی بخش گئے، اس بات کو ثابت کرنے کے لیے دنیا کا چپہ چپہ گواہ بننے کو تیار ہے، ارض بسطام سے خاک سرہند تک اور کوچہ بغداد سے شہر اجمیر تک یہ داستان مہر و وفا اور حکایت سوز و عشق ذرّے ذرّے پر رقم ہے، تاہم اس داستان کو پڑھنے کے لیے علم کی خشونت نہیں عرفان کی لذت درکار ہے، تب معلوم ہوگا کہ انقلاب فتویٰ سے نہیں تقویٰ سے آتا ہے اور وہ شوخی دکھانے سے نہیں اپنی ہستی مٹانے سے برپا ہوتا ہے۔

جماعت اولیاء ہمارے شکریے کی مستحق ہے کہ اس کے افراد خاک بسر رہ کر ہمارے لیے سرمایہ فخر چھوڑ گئے، ان کا نالہ نیم شبی ہمیں نئی زندگی دے گیا، ان کی آہ سحر گاہی نے خود آگاہی کی راہ سجھا دی، ان کی راتوں کی ناآسودگی نے ہمیں نفس کی آلودگی سے بچائے رکھا، ان کے طرز بندگی نے انسانوں کو شعور زندگی عطا کر دیا، اور ان کی شکستگیٔ دل نے رونق محفل بڑھا دی۔

سید العارفین حافظ الملّت والدین حضرت حافظ محمد صدیقؒ بانی خانقاہ بھرچونڈی شریف (سندھ) انہی لوگوں میں شامل ہیں جن کی موجِ نفس شمع کشتہ کو جلا سکتی ہے، جن کی خلوت گزینی پر رونق انجمن نچھاور کرنے کو جی چاہتا ہے، جن کے سینے معرفت

خداوندی کے خزینے، اور جن کی آستینوں میں یدِ بیضا چھپے ہوتے ہیں، یہ مرد درویش 1234ھ کو بھر چونڈی کے بے آب و گیاہ اور بنجر و ویران مضافات میں پہلی سانس لیتا ہے اور جب 1308ھ میں اس کا دم آخریں آتا ہے، تو اس درمیانی عرصے میں آب گیاہ سے محروم خطہ ذکر الہ سے معمور ہو چکا ہوتا ہے۔ اور بنجر و ویران علاقہ عشق و مستی کے کاروان میں بدل چکا ہوتا ہے، اس درگاہ کے تمام فقراء آب وہوا میں نہیں یاد خدا میں جیتے تھے، یہ لوگ ذاتی حوالے سے تکمیل آرزو میں نہیں رضائے الٰہی کی جستجو میں رہتے تھے، ذکر و فکر میں اس طرح محو رہتے کہ اللہ کا نام ان کا تکیہ کلام بن گیا تھا، **لا الہ الا اللہ** ان کی روز مرّہ کی زبان تھی، کسی کو بلانا ہو، پانی مانگنا ہو، گھر میں آنا ہو، آغاز کلام کرنا ہو، رخصت لینا ہو، دروازے پر دستک دینی ہو، **لاالــہ الا اللہ** کہہ کر متوجہ کرتے، زبان کی پاکیزگی کے ساتھ ساتھ یہ امر بھی پیش نظر او رملحوظ خاطر ہوتا کہ ہمارا ہونا نہ ہونا، سانس کی آمد و شد، نفع و نقصان، طلب و رسد، سب کچھ اللہ کی ذات سے منسوب اور اللہ کے نام سے موسوم ہے۔

بھر چونڈی شریف میں درسگاہ قادریہ کا قیام 1258ھ میں عمل میں آیا، جب حضرت شیخؒ دنیا سے 1308ھ میں رخصت ہوئے تو بھر چونڈی شریف کی گمنام بستی ہی نہیں پوری وادی مہران (سندھ) کوہ چلتن (بلوچستان) کا دامان اور جنوبی پنجاب کا میدان ذکر الٰہی سے گونج رہا تھا، ایک محتاط اندازے کے مطابق حافظ الملتؒ کی زندگی میں تین لاکھ افراد اس عظیم الشان خانقاہ اور روحانی تربیت گاہ سے منسلک اور فیض یاب ہوئے، وہ لوگ جو بعد میں رشد و ہدایت کے آفتاب بن کر چمکے، کسی زمانے میں وہ خاک بھر چونڈی کے ذرّے رہے۔

دل میں سما گئی ہیں قیامت کی شوخیاں
دو چار دن رہا ہوں کسی کی نگاہ میں

دین پور کی خانقاہ کے شیخ اعظم حضرت خلیفہ غلام محمدؒ آپ ہی کے مرید اور خلیفہ مجاز

تھے، انہی خلیفہ صاحب نے وہ فیض پایا کہ جب واپس دین پور پہنچے تو علاقے کے ہر درخت کا پتہ پتہ اللہ اللہ کا ورد کرنے لگا، برصغیر کی بین الاقوامی شہرت یافتہ تحریک ریشمی رومال کی سرپرستی خلیفہ صاحبؒ نے فرمائی، امروٹ (سندھ) کے خلیفہ تاج محمود امروٹیؒ بھی آپ کے دامن سے وابستہ ہوئے اور مراد پائی، انگریزی استعمار کے خلاف مجسم تحریک، پیکر بغاوت اور شعلہ جوالا مولانا عبید اللہ سندھیؒ کو نور ایمان، ذوق عرفان اور جوہر ایقان حضرت حافظ الملتؒ کے قدموں میں بیٹھنے سے ملا، جب مولانا سندھیؒ آپ کی خدمت میں پہنچے تو آپؒ نے فرمایا ''عبید اللہ نے ہم کو اپنا ماں باپ بنایا ہے'' مولانا سندھیؒ کہا کرتے تھے کہ ''حضرت کے ان الفاظ کی تاثیر آج تک میرے دل و دماغ میں موجود اور محفوظ ہے، میں انہیں اپنا دینی باپ سمجھتا ہوں اس لیے سندھ کو اپنا مستقل وطن بنایا میں نے قادری طریقے میں آپ سے بیعت کی۔ اس کا یہ نتیجہ مرتب ہوا کہ بڑے سے بڑے آدمی سے میں مرعوب نہیں ہوتا۔''

(کابل میں سات سال: مولانا سندھیؒ)

میں نے اپنے مضمون کا عنوان ''جنید وقت'' قائم کیا ہے، یہ خطاب اور لقب کسی مغلوبِ عقیدت کے منہ سے محض جوش ارادت کے حوالے سے نہیں نکلا، بلکہ سرد و گرم چشیدہ، سنار کی تول تولنے والے نقاد اور آنکھیں کھول کر دیکھنے پرکھنے والے مبصر مولانا عبید اللہ سندھیؒ نے حضرت کی روحانی منزلت اور پاکباز شخصیت کو اس لقب کے لیے موزوں پا کر آپ کو ''جنید وقت'' کہا۔

آج ایک عالم مولانا سندھیؒ کے جذبہ حریت، عشق آزادی، نعرہ انقلاب، اور مزاج فقر کا مداح اور گواہ ہے، لیکن مولانا سندھی حضرت حافظ صاحبؒ کی دہکائی ہوئی بھٹی کا ایک شرارہ تھا جو اس شان سے بھڑکا کہ انگریزی تخت و تاج کو بھسم کر کے رکھ دیا، جیکب آباد سندھ کے حضرت خلیفہ دل مراد خاںؒ بھی آپ کے دستر خوان کرم کے خوشہ چین تھے، عراق کے خلیفہ محمد عمر شاہؒ کو فیض بھی اسی در دولت سے ملا، کوئٹہ کے خلیفہ ابو

الخیرؒ چشمہ والے کو بھی آپ سے نسبت بیعت حاصل تھی، کابل کے خلیفہ عبدالرحمانؒ نے اسی در کے ٹکڑے کھا کر خود کو دربدر ہونے سے بچالیا، وہ جو علامہ اقبالؒ نے کہا ہے:

انوکھی وضع ہے سارے زمانے سے نرالے ہیں
یہ عاشق کون سی بستی کے یارب رہنے والے ہیں

تو انھوں نے بجا طور پر حضرت حافظ صاحبؒ جیسے لوگوں کے بارے میں کہا ہے، جو کیکر کے معمولی درخت کے نیچے عمر گزار کر اس شان سے دنیا کو الوداع کہتے ہیں کہ ہزاروں انسانوں کے دلوں پر ان کا تخت بچھا ہوتا ہے، عمر بھر ٹھنڈے پانی کو ترسنے والے کی درگاہ روحانی پیاسوں کو سیراب کرتی نظر آتی ہے، اللہ کے نام کی سربلندی کے لیے گمنامی کی چادر اوڑھ کر بیٹھ رہنے والے اپنے ''بکل'' میں ایک زمانے کو سمو لینے کی طاقت رکھتے ہیں، اور حق ھو کی ایک ضرب سے حرص و ہوس کا قلعہ خیبر اکھاڑ پھینکتے ہیں۔

☆☆☆☆

فقیہہ اعظم

میں عمر کے اس حصے میں تو ظاہر ہے ابھی داخل نہیں ہوا جب انسان زندگی سے بیزار اور سفر حیات سے تھک چکا ہو، رونق دنیا اس کے لیے بے معنی اور شہروں کی رنگینیاں بے کیف ہو چکی ہوں، میلے ٹھیلے اپنا رنگ کھو اور دل کے ارمان سو چکے ہوں، ذہن افسردہ اور دماغ پژمردہ ہو چکا ہو، بلکہ یہ حصہ عمر تو کچھ کر دکھانے کے ولولوں سے معمور ہوتا ہے۔ مستقبل کو محفوظ بنانے کی فکر میں غلطاں ہوتا ہے، بڑے شہروں میں پہنچ کر اپنے جوہر اور کمالات دکھانے کے لیے بے تاب ہوتا ہے، خود کو نیا آہنگ اور اپنے کام کو نیا ڈھنگ دینے کے منصوبے زیادہ تر اسی دور میں تیار ہوتے ہیں مگر نا معلوم کیوں میرے احساسات آج کل کی روش کے برعکس ہیں، لوگ قافلوں کی شکل میں اپنی بستیاں چھوڑ کر بڑے شہروں کا رخ کرتے نظر آتے ہیں اور میں لاہور میں بیٹھ کر خیالوں کی حد تک کسی بستی میں جا ڈیرہ جمانے کی فکر میں رہتا ہوں، لوگ بجلی کی چکا چوند کو ترستے ہیں اور میں مٹی کے دیے کی لو کا مشتاق ہوں، لوگ موٹر وے کے ارد گرد مکانوں کی جگہ ڈھونڈ رہے ہیں اور میں کسی دیہہ کے کچے راستے یا زیادہ سے زیادہ پگڈنڈیوں پر چلنے کے خواب دیکھتا رہتا ہوں، لوگ مینار پاکستان اور گول باغ کے اجتماع کے خواستگار ہیں اور میں گھاس پھونس کے دیہاتی چھپر کے نیچے بیٹھنے کا لطف لینا چاہتا ہوں، جہاں سردیوں میں انگیٹھی دہک رہی ہوتی ہے اور ساتھ ہی معمورہ دل گرمئ جذبات سے ابل رہا ہوتا ہے، لوگ شاہوں کے قرب کے لیے سیاسی و انتظامی مراکز

میں آباد ہونے کو بے چین ہیں اور میں کسی اللہ والے کے قدموں میں جگہ پانے کو بے قرار ہوں، یہ تانا بانا میرا دماغ اکثر بنتا رہتا ہے میں ایسا کر سکوں گا یا نہیں؟ اس سوال کا جواب خود مجھ پر ابھی واجب ہے، دوسروں سے بعد میں پوچھوں گا، لیکن اس سمند خیال کو شوق کا زور سے تازیانہ اس وقت لگا جب مجھے فقیہ اعظمؒ کانفرنس کے لیے مواد مہیا کیا گیا اور حضرت فقیہ اعظمؒ مولانا نور اللہ بصیر پوریؒ کی سوانح، ان کے علم و تفقہ اور سادگی و درویشی سے آگاہی حاصل ہوئی، میں ایک طرف سے ان کے حالات زندگی پڑھتا جاتا تھا، ان کے فتاویٰ کی گہرائی میں اترتا جاتا تھا، ان کی سادگی کے ناقابل یقین واقعات میں گم ہوتا جاتا تھا اور دوسری طرف بے اختیار منہ سے نکلتا جاتا تھا۔

اب انہیں ڈھونڈ چراغ رخ زیبا لے کر

میں لاہور، کراچی، اسلام آباد، پشاور اور ملتان کا مخالف نہیں لیکن جس طرح مولوی مدن کی سی بات ہر ایک میں نہیں ہوتی اسی طرح جو بات چھوٹے قصبوں اور دیہات میں ہے وہ بڑے شہروں میں کہاں؟

بلاشبہ شہروں میں کئی کنال کی حویلیاں اور کوٹھیاں ہوتی ہیں مگر بدقسمتی سے ظرف بڑے تنگ ہوتے ہیں، محلات کی فصیلیں بہت اونچی مگر محبت کی سطح بڑی پست ہوتی ہے، چہرے بہت بارونق مگر دل کی دنیا ویران و بے آباد، بول بڑے دلکش مگر معنی بڑے ہی دل شکن، لباس اجلا مگر من؟ یہ مجھ سے مت پوچھیے اس کا جواب ہر ایک کو آتا ہے، الفاظ و حروف کا ایک ہجوم شہروں میں ملتا ہے مگر مغز بہت کم کسی نے دیکھا ہے، ناموں کے آگے پیچھے القاب و خطابات کی ایک لمبی قطار مگر ملنے پر عالم بالا کی سخن فہمی معلوم ہو جاتی ہے۔

غالباً قدرت حق کی یہی حکمت رہی کہ اس نے نوع انسانی کی سب سے بڑی اور شاندار تہذیب کے لیے وادی غیر ذی زرع کو منبع بنایا، ورنہ اس دور میں صفحہ ارض پر روم و ایران اپنی پوری آب و تاب اور جلالت و شکوہ کے ساتھ موجود تھے۔

کئی حسرتوں کی طرح اس حسرت ناتمام پر بھی میں نوحہ کرتا رہوں گا کہ ایک بار مولانا نور اللہ نعیمیؒ سے مل لیتا اور اپنے عقیدے کو تقویت دے لیتا اور بصیر پور جیسے دور افتادہ اور دیہاتی آغوش کے پروردہ قصبے سے ایک پرشکوہ اور روح پرور شخصیت کے ظہور کو اپنی آنکھوں سے دیکھ لیتا اور انسانوں کی بھیڑ میں کھو کر تنہا رہ جانے والے آدمی سے کہہ سکتا۔

ڈھونڈ اجڑے ہوئے لوگوں میں وفا کے موتی
یہ خزانے تجھے ممکن ہے خرابوں میں ملیں

آدمی جس طرح عطاّر کی دکان پر پہنچ کر پریشان ہو جاتا ہے کہ وہ کون سا عطر خریدے کیونکہ چار سو خوشبو کی لپٹیں اس کے مشام کو اس طرح مست کر دیتی ہیں کہ ایک پر دوسرے کو فوقیت دینا اور بہتوں میں سے ایک کو چن لینا اس کے لیے بے حد مشکل ہو جاتا ہے اسی طرح کسی پہلو دار شخصیت پر گفتگو کرنا اور مقالہ لکھنا خاصا مشکل کام ہوتا ہے کیونکہ

کرشمہ دامن دل می کشد کہ جا اینجا است

والی صورت حال سے آدمی کو واسطہ پڑ جاتا ہے بلاشبہ مولانا نور اللہ بصیر پوریؒ طرحدار شخصیت تھے، بصیر پور جیسے علمی مراکز سے کوسوں دور قصبے میں چشمہ علم جاری کرنا اور جنگل میں منگل کا سماں پیدا کرنا کوئی معمولی کارنامہ نہیں، اس امر کے تمام اسرار و غوامض کا جائزہ لینا بذات خود ایک تحقیقی مقالے کا مواد ہے، یہ تو کوئی صوفیاء کی روحوں سے پوچھے کہ انہوں نے کس طرح جان جوکھوں میں ڈال کر خارزاروں کو گلزاروں میں بدل ڈالا تھا، اجودھن کی بستی پنجاب بھر کی روحانی خانقاہ کیسے بنی؟ کوئی بابا فریدؒ سے پوچھے، اجمیر جیسا گمنام قصبہ ولی الہندؒ کی جلوہ گاہ کیسے بنا؟ خواجہ اجمیرؒ ہی کچھ بتا سکتے ہیں، کیکر اور سرکنڈوں کا بے نشان گوٹھ بھرچونڈی شریف انقلابیوں کی تربیت گاہ کا درجہ کیسے پا گیا؟ اس سوال کا جواب جنیدِ وقت حافظ محمد صدیقؒ ہی دے سکتے ہیں، غرض کہ

بصیرپور کو ایک نیا تعارف عطا کرنا اور اسے گہوارہ علم و تفقہ بنا دینا ایک وسیع و بسیط مضمون کا تقاضا کرتا ہے۔

مولانا بصیرپوریؒ پچاس برس تک مسند آرائے درس وفتویٰ رہے مگر ہوس جاہ، حُب مال، طلب منصب، جلب منفعت، قرب شاہی اور ذوق خودنمائی سے کامل طور پر محفوظ رہے یہ ایک اور شاندار پہلو ہے، فقیہ اعظمؒ نے درس گاہ بنائی، طلبہ کی ضروریات فراہم کیں، چھوٹے بڑے اسباق پڑھائے۔ علاقے کی ناموافق فضا کا مقابلہ کیا، پہلے سے موجود رسوم کے اندر سے مصلحانہ راہ نکالی یہ سب کچھ کتنا کٹھن کام ہے مگر بایں ہمہ تین ہزار صفحات پر محیط فتاویٰ قلمبند کیے۔ یہ بھی کوئی معمولی موضوع نہیں، کہنے کا مقصد یہ ہے کہ ایسی شخصیات پر جامعیت کے ساتھ لکھنا پڑھنا صحرا میں سونا ڈھونڈنے سے بھی زیادہ مشکل کام ہے۔

میں نے مولانا نوراللہ بصیرپوریؒ کے متعلق جتنا پڑھا اور سنا ان کی ذات کا ہر پہلو دلآویز نظر آیا، میں اپنے دل کی بات کہتا ہوں اور سچے دل سے کہتا ہوں کہ انسانیت کو نہ آکسفورڈ یونیورسٹی کچھ دے سکتی ہے اور نہ کیلیفورنیا، نہ بڑی ڈگریاں انسان کو بڑا بنا سکتی ہیں اور نہ پجیرو جیسی گاڑیاں، اس دور پرآشوب میں تو ان جیسے فرش نشین اور تہبند باندھنے والے ہی ہوس دنیا میں ہلکان انسان کو سکون کا درس دے سکتے ہیں، مختلف عصبیتوں میں اندھے آدمی کو یہی اللہ والے سرمہ بصیرت عطا کر کے بینا بنا سکتے ہیں، روائتی کہانی کے مطابق اب انسان خود ہی اس موڑ پر پہنچنے والا ہے کہ وہ دور حاضر کے فانوس دے کر اگلے وقتوں کے چراغوں کا گاہک بن جائے گا، اس لیے کہ آج بجلی کے قمقموں میں دن کو بھی کچھ سجھائی نہیں دیتا جبکہ گزشتہ دور کے ٹمٹماتے دیئے گھپ اندھیروں میں منزل کو آنکھوں کے سامنے کر دیتے ہیں، مانا کہ آج کا دور خلاء کا دور ہے، ایٹم کا عہد ہے، کمپیوٹر کی صدی ہے، بڑے بڑے فلاسفروں، سائنسدانوں اور موجدوں کا زمانہ ہے، مگر کوئی آبادی کے اس ہجوم میں رومیؒ و عطارؒ تو پید کرے، اجمیریؒ و

کا کیؒ تو ہمیں دکھائے، گنج شکرؒ اور قبلہ عالمؒ جیسے لوگ تو سامنے لائے، فقیہ اعظم مولانا نور اللہ بصیر پوریؒ پر کچھ لکھتے ہوئے میرے سامنے ان کے دو خطوط کے اقتباس آئے جو میرے دل کی آواز ٹھہرے اور آج کے حالات میں انکی افادیت دو چند نظر آتی ہے۔

61ء میں ایک صاحب کو خط میں لکھتے ہیں۔

''اس وقت دنیا عجیب دور سے گزر رہی ہے خصوصاً علماء کی عجیب حالت ہے علماء کا آپس میں لڑنا بھڑنا۔ وہ ایک دوسرے کی تکفیر و تضلیل و تفسیق کر رہے ہیں، وعظ ہے کہ وہ بھی اٹیک اور اعتراض کے رنگ میں یا صرف بعض فرقوں کا خیال کر کے کر رہے ہیں اور ضروری مسائل اور ارکان اسلام کی طرف توجہ نہیں، یہ عجیب بات ہے اور سنت مبارکہ کے بالکل خلاف ہے''

میرے خیال میں مولانا نور اللہ بھی اپنے مسلک سے اتنی محبت کرتے تھے جتنی کسی کو ہے لیکن محبت اپنے ردعمل میں کبھی نفرت کو جنم نہیں دیتی اور آج کے دور کا بالخصوص مذہبی حلقوں کا یہی المیہ ہے جس سے علماء کا وقار، رجال دین کا مرتبہ اور بذات خود اسلام کا پیغام متاثر ہو رہا ہے۔

دوسرے خط میں بھی اسی دردمندی کا اظہار ہے، یہ ان کی صفائی دل، اور اخلاص فی الدین کا نتیجہ ہے کہ وہ دین کی نصیحت سمجھتے رہے کسی کی فضیحت ان کو مطلوب نہ تھی، اس معاملے میں صوفیاء کرام کو پوری امت میں یہ امتیاز حاصل رہا ہے کہ وہ عمر بھر قینچی کے بجائے سوئی سے کام لیتے رہے یعنی کاٹنے کے مقابلے میں جوڑنے کا اہتمام کرتے رہے، صوفیاء کا تو مزاج ہی یہ تھا کہ

شدہ است سینہ من پراز محبت یار
برائے کینہ اغیار در دلم جا نیست

خواجہ نظام الدین دہلویؒ فرمایا کرتے تھے کہ اگر تم کانٹوں کے بدلے کسی کے راستے میں کانٹے ہی بچھاتے رہو گے تو دنیا پھولوں سے خالی ہو جائے گی۔

قدرت گاہے گاہے مولانا بصیر پوریؒ جیسی شخصیات پیدا کرتی رہتی ہے اور پوری دنیا پھولوں سے بالکل خالی نہیں رہتی وگرنہ جس طرح عہدِ رواں میں خطیب شہر ترش ابرو اور منبر ومحراب لرزہ براندام ہیں تو کسی کا سانس لینا مشکل ہو جائے، ارباب مذہب وافتاء کو ضرور غور کرنا چاہیے کہ زمانہ قیامت کی چال چل گیا ہے اس کی نزاکت کو بھانپ کر اصلاح ورہنمائی کا کام کیا جائے، ورنہ تو لوگ کہہ ہی رہے ہیں۔

جیسی اب ہے تیری محفل کبھی ایسی تو نہ تھی

اس امت پر رجال دین کا بڑا احسان ہوگا کہ وہ محفل کا رنگ اجڑنے نہ دیں، شمع کی لو مٹنے نہ دیں، بند ہوتے ہوئے بازاروں کے آخری چراغ بجھنے نہ دیں، نبض انسانیت ڈوبنے نہ دیں، بلکہ ارباب صدق ومعرفت کے فیض تعلیم کے بل بوتے پر ہمت کر کے اٹھیں اور معمورۂ ہستی کی تاریکی کو روشنی میں بدل دیں، کہ یہی کرنے کا اصل کام ہے۔

☆☆☆☆

ہفت رنگ ہیرا

جس طرح کسی ہفت رنگ ہیرے کو سورج کے سامنے کیا جائے اور بدل بدل کر اس کا ہر کونہ شعاعوں کے برابر لایا جائے تو ہر رنگ اپنی بہار دیتا ہے، کہیں سے ارغوانی، کہیں سے عنابی، کہیں سے سنہری کہیں سے ازقونی، کہیں سے حنائی، کہیں سے بلوریں اور کہیں سے احمریں عکس جھلکتا ہے اسی طرح اگر امیر ملت حضرت پیر جماعت علی شاہؒ کی شخصیت اور خدمات کو وقائع و حوادث کے آئینے میں دیکھا جائے تو ہر زاویے سے نئی تصویر ابھرتی ہے، اور وہ تصویر بہت ہی دلکش اور نظر نواز ہے، کسی شخص کو تاریخ میں زندہ رکھنے کے لیے اس کا ایک ہی جاندار پہلو کافی ہوتا ہے۔ کوئی محدث ہو کوئی مفسر ہو کوئی متکلم ہو، کوئی خطیب ہو، کوئی ادیب ہو، کوئی فلسفی ہو، کوئی صوفی ہو، کوئی سپہ سالار ہو، کوئی شاعر ہو اور کوئی سیاسی رہنما ہو بس ایک ہی میدان کا مرد ہونا اس کی شناخت کے لیے بہت ہے لیکن امیر ملت کے ہاں ان کی دائمی زندگی اور مستقل شناخت کے لیے اتنے پہلو ہیں کہ تاریخ جتنی بار نئی کروٹ لے اس کی ہر کروٹ سے امیر ملت ابھر کر سامنے آئیں گے زمانہ جتنی بار گردش کھائے، ہر گردش سے امیر ملت کی تصویر نکھر کر سامنے آ کھڑی ہو گئی اور وقت چاہیے جتنے پہلو بدلے اس کے ہر پہلو سے امیر ملت نیا جنم لیتے دکھائی دیں گے ظاہر ہے جو شخص مولانا عبدالوہاب امرتسریؒ کا شاگرد ہوں اس کے یہ کمالات وہی نہیں ہوں گے تو اور کیا ہو گا؟ جس نے مولانا غلام قادر بھیروی کے سامنے گھٹنے ٹیکے ہوں وہ اتنی خوبیوں کو اپنے اندر جمع کرنے پر قادر نہیں ہو گا تو اور کیا ہو

گا؟ جس نے رشتہ قلمند مولانا محمد مظہر کھارنپوری سے جوڑا ہو تو وہ شریعت وطریقت کا مظہر نہیں بنے گا تو اور کیا ہو گا؟ جس نے مولانا فیض الحسن کھارنپوری سے فیض پایا ہو اس سے ایک زمانہ فیضیاب نہیں ہو گا تو اور کیا ہو گا؟ جسے مولانا احمد حسن کانپوری سے صحبت رہی ہو اس کی شخصیت میں حسن پیدا نہیں ہو گا تو اور کیا ہو گا؟ جسے مولانا ارشار حسین رام پوریؒ کا قرب میسر رہا ہو اس کے رشدوارشاد کے چرچے دنیا میں نہیں ہوں گے تو اور کیا ہو گا؟ جس کے سر پر مولانا شاہ فضل رحمٰن مراد آبادیؒ کا دست شفقت رہا ہو اس پر اللہ کا فضل بارش بن کر نہیں برسے گا تو اور کیا ہو گا؟ جو مولانا شاہ عبدالحق الہ آبادیؒ کے درس میں پڑھتا رہا ہو وہ حق گوئی کا پیکر نہیں بنے گا تو اور کیا ہو گا؟ جو مولانا سید محمد علی مونگیریؒ کے حلقہ تدریس میں شامل رہا ہو اس پر محمد (ﷺ) اور علی (رضی اللہ عنہ) گوشہ دامان رحمت اور سایہ عاطفت نہیں ہو گا تو اور کیا ہو گا؟ جو مفتی محمد عبداللہ ٹونکی کے مکتب کا فرد ہو وہ عبادت الٰہی میں سرمست نہیں ہو گا تو اور کیا ہو گا؟ جو قاری عبدالرحمان پانی پتی سے چار حروف پڑھا ہو وہ بڑے بڑوں کا پتہ پانی نہیں کرے گا تو اور کیا کرے گا؟ جو علامہ عمر ضیاء الدین استانبوی کا تربیت یافتہ ہو وہ چار دانگ عالم میں ضیا پاشی نہیں کرے گا تو اور کیا کرے گا؟ اور جو میر محمد عبداللہ کی خدمت میں رہا ہو وہ امیر ملت نہیں بنے گا تو اور کیا ہو گا؟ یہ سب وہ لوگ ہیں جو آپ کے اساتذہ کرام ہیں۔

امیر ملت کو دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ ایک شخص مجمع کی مدت کیسے بن جاتا ہے؟ اور اپنے اندر خوبیوں کو اس قدر کسی پہلو طرح سمیٹ لیتا ہے؟

عشق رسولؐ کا عالم ہے تو یہ کہ مدنیہ منورہ میں راہ چلتے ہوئے ان کے ایک مرید کے نوکیلے پتھر لگنے سے وہاں راستے میں سویا ہوا کتا زخمی ہو جاتا ہے خون کی معمولی دھار نکلتی ہے تو امیر ملت کی دھاڑ نکل جاتی ہے سر سے پگڑی اتار کر اس کی مرہم پٹی کرتے ہیں اور برہم ہو کر کہتے ہیں ”ارے یہ تم نے کیا غضب ڈھا دیا۔ تمہیں نہیں

معلوم کہ خدا جانے کون کون سا ولی کامل کیا کیا روپ دھار کر مدینے کی گلیوں میں پڑا ہوتا ہے؟ زیارت حرمین کے شوق کی یہ کیفیت ہے کہ دو چار بار نہیں، درجن بھر نہیں بلکہ پچپن مرتبہ حج کی سعادت حاصل کی، دست سنی کا رنگ یہ تھا کہ حجاز ریلوے لائن کی تعمیر کے لیے 1910ء میں چھ لاکھ روپے عطیہ دیئے جو آج چھ کروڑ بنتے ہیں علم و تعلم کی ترویج میں دلچسپی اتنی کہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کو تین لاکھ روپے نقد چندہ فراہم کیا، خانہ خدا سے محبت کا رنگ دیکھیئے کہ علی پور سیدا کی مسجد نور پر آج سے پچھتر سال پہلے چھ لاکھ روپے کی خطیر رقم صرف کی اسے اس قدر شاندار باوقار اور یادگار بنایا کہ ہر مسجد میں عبادت تو ہوتی ہی ہے مسجد نور کو زیارت کے قابل بنا دیا عام طور پر صوفی اور پیر کا تصور اور اس کے بارے میں مجموعی تاثر یہ ہوتا ہے کہ یہ لوگ صرف حق ہو کی ضربوں میں مشغول رہتے ہیں، ہر وقت محو مراقبہ اور سر بگریباں رہتے ہیں یہ محض چلّے وظیفے کے ماہر ہوتے ہیں ان کی مجلیس بس کرامات کے تذکروں سے معمور ہوتی ہیں یہ ہر لحظہ تسبیح بدست اور نوافل وائد کار میں مست الست رہتے ہیں، لیکن حضرت امیر ملت کا معاملہ بہت جداگانہ ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ جب آپ عالم جذب میں ہوتے ہوں گے تو دنیا تو کیا انکی اپنی ذات بھی وہاں راہ نہیں پاتی تھی مگر جب اجتماعی معاملات ان کے سامنے آئے تو وہ یکدم زاہد سے مجاہد بن جاتے تھے۔ کوئی ایسی اجتماعی اسلامی تحریک نہیں جس میں آپ کا رول قائدانہ نہ رہا ہو تحریک خلافت چلی تو آپ اس کا ہراول دستہ بنے، مسجد شہید گنج کا مسئلہ آیا تو اس موقع پر آپ کو "امیر ملت" کے باوقار لقب سے نوازا گیا، مسجد کانپور شہید ہوئی تو آپ کا کردار غازیانہ رہا غازی علم الدین شہید کا کیس چلا تو آپ پیش پیش تھے اور اس شہید محبت کا مزار بھی آپ نے بنوایا۔ رد قادیانیت میں 1904ء سے 1908ء تک کفن بردوش رہے اور تازیست یہ فرض نبھایا۔ رہ گئی تحریک پاکستان تو برصغیر ہند کا وہ کون سا شہر، قصبہ، قریہ، گوشہ، کونہ اور چپہ ہے جہاں آپ کے قدم نہیں پہنچے۔ 1944ء میں سری نگر میں قائد اعظم کی شاندار ضیافت کر کے قائد اور تحریک

پاکستان کے ساتھ اپنی غیر مشروط محبت اور معاونت کا مظاہرہ کیا۔ مسلم لیگ کی حمائت کے معاملے میں مشائخ کرام کی قیادت فرمائی ۔ 1925ء میں مراد آباد میں ''آل انڈیا سنی کانفرنس'' ہوئی۔ 35ء میں اسی نوع کی کانفرنس بدایوں میں منعقد ہوئی اور مشہور عالم سنی کانفرنس، 1946ء میں بنارس شہر میں برپا ہوئی۔ جس کی صبح کا حسن ہمارے اردو ادب کا حسین استعارہ ہے اور حقیقت ہے کہ بنارس ہی کی کانفرنس قیام پاکستان کے لیے نوید صبح ثابت ہوئی، ان تینوں کانفرنسوں کی صدارت کا اعزاز آپ کو حاصل ہوا۔ واقعہ یہ ہے کہ اس مرد قلندر نے علی پور جیسے دور افتادہ قصبے میں بیٹھ کر خود کو محسوس نہیں کر لیا تھا بلکہ ہر فورم پر اپنے آپکو محسوس کرایا۔

وہ گوشہ عافیت کے آدمی نہیں تھے بلکہ جادہ مزاحمت کے راہی تھے، وہ محض مراقبہ و ذکر کرنے والے نہیں ملت کی فکر رکھنے والے تھے، وہ شب زندہ دار بھی تھے اور میدان سیاست و قیادت کے شہسوار بھی تھے، اگرچہ وہ زاہد مرتاض تھے لیکن ساتھ ساتھ اسلامیان ہند کے ماہر فیاض بھی تھے، تبھی تو مولانا شوکت علی نے آپ کو ''سنوسٹی ہند'' کا لقب دیا۔ آپ فقط خلوت کی نہیں مرجعیت کی شان رکھنے والے تھے، علم و شریعت کے کتنے آفتاب و ماہتاب تھے جو علی پور سیداں کے ذرّوں کی چمک دیکھنے آئے۔ امور سے سید دیدار علی شاہ چل کر آئے کچھوچھہ سے سید محمد احمد یہاں پہونچے، مراد آباد سے مولانا نعیم الدین تشریف لائے سورت سے شاہ وضی احمد محدث عالی پور کی سلامی کو آئے لاہور سے مولانا ابوالحسنات قادریؒ کا آنا ہوا۔ اسی طرح نامور شخصیات بھی حصول فیض اور شرف ملاقات کو بے تاب رہیں سر آغا خان، نواب وقار الملک، مولانا شوکت علی، نواب احمد یار دولتانہ، سر شاہنواز ممدوٹ، نواب افتخار حسین ممدوٹ، میاں افتخار الدین، مولانا ظفر علی خاں، مولانا عبد الستار خان نیازی اور میاں ممتاز دولتانہ یہ سبھی آپ کی دعا تعاون اور تعلق کے طالب رہے۔

حضرت امیر ملتؒ کی ہمہ پہلو ذات انکی روشن خدمات اور آپ کے امت کے لیے

درد سے معمور جذبات کو سامنے رکھ کر میرا قلم یک بیک اور بے ساختہ اس موضوع پر اٹھ جاتا ہے کہ آج بھی مشائخ کرام پر لازم ہے کہ وہ اپنے بزرگوں کی روایات کے مطابق معاشرے میں رہبیر اور پیشوا کا کردار ادا کریں۔

جہاں پہلے ہی اندھیرے ہوں وہاں مشائخ بھی مقتداء کے بجائے متقدی بن جائیں تو روشنی کہاں سے آئے گی؟ اگر مشائخ بھی قناعت پر آمادہ ہو جائیں تو قیادت کون سنبھالے گا؟ اگر مشائخ بھی حکمرانوں کے پہلو میں آسائش اور عزت تلاش کرنے میں لگ جائیں تو عزیمت و استقامت کی مثال کون بنے گا؟ اگر مشائخ بھی اطلس و کمخواب کے لباس اوڑھنے پہ آ جائیں تو غریبوں کی آس کون بندھائے گا؟ ایک بار نواب افتخار ممدوٹ نے حضرت امیر ملت ؒ کے پاس آنا تھا۔ آپ نے مدنیہ منورہ کا کھدر پہن رکھا تھا خادم نے کہا قبلہ! ذرا لباس بدل لیجئے آپ نے فرمایا ''اس وقت میرے بدن پر مدینے کا کھدر ہے اس کے ہوتے ہوئے کسی کی نوابی اور ممدوٹی نہیں چلتی''

میں سوچتا بلکہ کڑھتا ہوں کہ ایسا زور دار قلم کہاں سے لاؤں، جو مشائخ کی داستان فضلیت و عظمت ایسے انداز میں لکھے کہ انہیں یقین ہو جائے کہ واقعی وہ خاکبازی کے لیے نہیں بلکہ اندیشہ افلاکی کے لیے پیدا ہوئے ہیں۔ میں ایسے الفاظ کہاں سے لاؤں جن کا ایک ایک شوشہ مشائخ کرام کی شان کا ترجمان بن جائے اور وہ جان جائیں کہ ان کے دامن فقر میں پیوند تو ہر دور میں رہے ہیں لیکن دھبہ کبھی دکھائی نہیں دیا۔ میں ایسا پیرایۂ بیان کہاں سے ڈھونڈوں جو مشائخ کرام کو ان کے منصب اور نسبت کا توانا احساس دلائے کہ حکمرانوں کے یہ پایہ تخت چوبیں ہیں اور سخت بے تمکیں ہیں جب کہ مشائخ کی مسند دراصل رسول خدا ﷺ کی مسند ہے جسے نہ وقت کی کروٹیں کمزور کر سکتی ہیں اور نہ زمانے کی آندھیاں اپنی جگہ سے ہٹا سکتی ہیں، یہ حکمران زرو جاگیر کے بل بوتے پر زندہ ہیں اور زرو جاگیر اصل نہیں سایہ ہے جو وقت ڈھل سکتا ہے جب کہ مشائخ کی عزت علم سے ہے اور طاقت عرفان سے ہے جسے نہ آگ جلا سکتی ہے

اور نہ زمین کھا سکتی ہے مشائخ کسی حکمران کا پہلوئے عاطفت کیوں تلاش کرتے ہیں؟ مانا کہ صدر مملکت کا گھر مرمر کی سلوں سے آراستہ ہے مگر پھر بھی خانہ خدا کی نیچی اور ٹیڑھی انیٹوں کا مقابلہ نہیں کر سکتا تسلیم کہ گورنر ہاؤس فانوسوں سے آراستہ ہے مگر مسجد کے مٹی کے دیئے سے زیادہ مقدس نہیں۔ بلاشبہ ایوان صدارت اور قصیر وزارت میں بیش قیمت قالین ہوتے ہیں مگر مسجد کی چٹائی کا ایک تنکا ان سے زیادہ پاکیزہ اور لائق احترام ہے، صدارتی محل کی مرمریں راہداریوں کو جوتے کے تلووں سے لتاڑا جا سکتا ہے لیکن مسجد کے کچے صحن پر صدر مملکت کو بھی اپنی پیشانی رگڑنی پڑتی ہے۔ فرمایئے کس کا مرکز اچھا اور کس کی نسبت بڑی؟ فقیروں کی یا حکمرانوں کی؟ اگر مشائخ بھی حکمران کی بانہوں میں بانہیں ڈالنے کو بے قرار ہوں اور ان سے ملاقات کو "ملاقات مسیحا و خضر" کا درجہ دیں تو امام احمد بن حنبلؒ اور مجدد الف ثانیؒ کی میراث کون سنبھالے گا؟

اہل اللہ تو سوکھے ٹکڑے کھا کر گھر سے نکلتے اور مرغ دہانی کی قابوں کو اپنے خندہ استہزائے پھیکا بنا دیتے تھے مٹی کا پیالہ ہاتھ میں لے کر میخانہ و ساغر کی محفل کا رنگ بدل آتے تھے دو پیسے کی ٹوپی سر پر رکھ کر جاتے اور تاج و کلاہ کو تار تار کر کے آتے تھے دانائے راز اقبال نے اس لیے تو کہا ہے:

نہ تاج و تخت میں نے لشکر و سپاہ میں ہے
جو بات مرد قلندر کی بارگاہ میں ہے

☆☆☆☆

’’حکیم الامت‘‘

یوں تو حضرت علامہؒ کو قدرت نے وہ قامت زیبا عطا کی ہے کہ اس پر ہر خوبصورت لقب کی عبا راست آتی ہے انہیں ’’دانائے راز‘‘ کہا جاتا ہے اور اس میں کیا شک ہے کہ انہوں نے خاک راہ کو راز الوندی سے آشنا کیا، وہ ’’فیلسوف مشرق‘‘ ہیں بیکن نے ایک جگہ لکھا ہے کہ ’’فلسفے کا معمولی علم آدمی کو ملحد اور فلسفے کا گہرا ادراک انسان کو موحد بنا دیتا ہے‘‘ حضرت علامہؒ وہ فلسفی ہیں جنہوں نے فلسفے کو تشکیک سے نکال کر تصدیق کی راہ پر ڈال دیا، اسی کا نتیجہ تھا کہ انہوں نے نٹشے کے تکرار ازلی کو رد کر دیا اور کہا:

اگر ہوتا وہ مجذوب فرنگی اس زمانے میں
تو اقبال اس کو سمجھاتا مقامِ کبریا کیا ہے

حضرت علامہ کو ’’شاعرِ مشرق‘‘ کا لقب بھی دیا گیا ہے، انہوں نے شاعری کو وہ ملی تقدّس عطا کیا ہے جس کے سامنے تغزل کی اباحت شرما جاتی ہے۔

لیکن جس اہل دل اور صاحب نظر نے انہیں ’’حکیم الامت‘‘ کہہ کر پکارا، اس کے ذوق ملی کو بھی داد دینی چاہیے، اور علامہ کی شخصیت کو سامنے رکھ کر یہ کہنے میں بھی کوئی تامل نہیں کہ ان سے بڑھ کر اس لقب کا کوئی دوسرا مستحق نظر نہیں آتا۔

حضرت علامہؒ کی شخصیت، فکر اور فنی پختگی جب اوج کمال کو پہنچی تو ان کی نثر ہو یا نظم اس کا محوری نقطہ ’’امت‘‘ بن گئی، انہوں نے فرد بن کر سوچنا چھوڑ دیا، وہ ہمیشہ ہر

منظر کو امت کی آنکھ سے دیکھتے، ہر مسئلے پر امت کے نقطہ نظر سے غور کرتے، نفع و نقصان کو امت کی میزان میں تولتے، خیر وشر کو امت کے پیمانے سے ناپتے، حسن و قبح کو امت کی کسوٹی پر پرکھتے، علامہؒ کی زندگی میں ایک وقت وہ آ گیا کہ ان کا ذہن امت کا ترجمان، ان کا قلم امت کا حدی خوان، ان کی سوچ امت کی اپروچ، ان کی نثر امت کی فکر اور ان کی نظم امت کا غم بن کر رہ گئے، کبھی وہ امت کے حوالے سے فلسفے کی زبان میں بات کرتے ہیں، کبھی داعی اور مبلغ بن کر کلام کرتے ہیں، کبھی امت کے مرثیہ خوان نظر آتے ہیں۔ کبھی شکوہ لکھتے ہیں، کبھی رزمیہ انداز اختیار کرتے ہیں، کبھی طنزیہ رمز اپناتے ہیں، کبھی عالم ناسوت اور لاہوت میں پہنچ جاتے ہیں، کبھی بارگاہ رسالتمآب میں فریاد کناں ہوتے ہیں، کبھی جوانانِ ملت کو عقابی پرواز پر ابھارتے ہیں، کبھی ''یزداں بکمند آور'' کا نغمہ الاپتے ہیں، کبھی ماضی مرحوم کو آواز دیتے ہیں، کبھی حال کا رونا روتے ہیں، کبھی مستقبل میں جی اٹھنے کی خوشخبری دیتے ہیں، کبھی خلوت میں تڑپتے ہیں، کبھی جلوت میں پھڑکتے ہیں، کبھی نالہ نیم شبی کی آڑ لیتے ہیں کبھی باد صبح گاہی کو ڈھال بناتے ہیں، علامہ کا مدہو کہ جزر، سب کچھ وقف امت رہا، وہ اس سے خوش نہیں تھے کہ دنیا انہیں فیلسوف مشرق کہتی ہے بلکہ اس پر دلگیر تھے کہ امت مغلوب مغرب ہو رہی ہے، وہ اس پر نازاں نہیں تھے کہ انہوں نے یورپ کا فلسفہ کھنگال لیا ہے بلکہ اس سے آزردہ تھے، کہ امت میں فکری زوال آ رہا ہے، انہیں یہ گھمنڈ نہیں تھا کہ وہ عصر رواں کا دماغ ہیں بلکہ انہیں یہ غم تھا کہ شبستان امتِ بے چراغ ہے، انہیں یہ خوشی نہیں تھی کہ آخری دور میں ان کا ذاتی بنگلہ بن گیا بلکہ یہ فکر دامن گیر رہی کہ امت کا مضبوط فکری قلعہ تعمیر ہونا چاہیے، وہ اس پر مطمئن نہیں تھے کہ ان کی بات اب ہر محفل میں کہی جا رہی ہے بلکہ انہیں اضطراب تھا کہ اقوام کی مجلس میں امت کی فریاد سنی جائے، وہ اس پر شاداں نہیں تھے کہ ہر ایک ان کے گن گا رہا ہے بلکہ یہ دیکھ کر پریشان تھے کہ آفتاب امت گہنا رہا ہے، انہیں یہ اطمینان نہیں تھا کہ اہل دانش کی نگاہیں ان کی طرف لگی ہیں

بلکہ اس کا ارمان رہا کہ اہل دنیا امت سے نظریں پھیر رہی ہے، انہیں یہ شوق نہیں تھا کہ وہ نابغہ اور عبقری کہلائیں بلکہ ان کی یہ خواہش تھی کہ افراد امت رمز خودی اپنائیں اور دنیا پر چھا جائیں، حضرت علامہ کی زندگی اس آرزو میں کٹی کہ ہر گام پر امت سرخرو اور باآبرو رہے، ان کے خطبات ہوں کہ اردو کلیات، فارسی کلام ہو کہ ملفوظات، ہر پہلو سے امت کا رنگ جھلکتا ہے، آپ پر لکھی جانے والی ہر کتاب میں غالب حصہ امت کے مسائل و معاملات کے لیے وقف ہے۔ خلیفہ عبدالحکیم کی ''فکر اقبالؒ'' ہو یا پروفیسر منور مرزا کی ''ایقان اقبال'' فقیر وحید الدین کی ''روزگارِ فقیر'' ہو کہ سید نذیر نیازی کی ''دانائے راز'' ہر جگہ علامہ کی امت میں دلچسپی گہری اور واضح دکھائی دیتی ہے، آج تو امت کا وجود امراض کی پوٹ بنا ہوا ہے۔ حضرت علامہ کے دور میں بھی اس کی حالت چنداں قابل رشک نہ تھی، مصائب کی نوعیت تو یکساں رہی البتہ آج اس کی سنگینی اور شدت بڑھ گئی ہے، اس زمانے میں بھی مشکلیں بے شمار تھیں آج بھی ان کے بیان کو دفتر چاہییں، فراق صرف یہ ہے کہ آج کے مسلم مفکر امت کے بجائے اپنی فکر میں زیادہ غلطاں ہیں، جبکہ اقبال کی رگوں میں خون نہیں امت مسلمہ کا درد دوڑ رہا تھا، سچی بات یہ ہے کہ حقیقی ماں باپ کو اپنی اولاد کے مستقبل کے لیے اتنی فکر مندی نہیں ہوتی جتنی اقبالؒ کو اس امت کے مستقبل کی فکر لاحق تھی، ماں باپ اپنی اولاد پر اتنا وقت صرف نہیں کرتے جتنا اقبال نے امت پر اپنا دماغ خرچ کیا ہے۔

اہل درد اور صاحب نظر جانتے ہیں کہ اقبال کسی طرح آدھی آدھی راتوں کو اٹھ کر بارگاہ رب العزت میں امت کا دکھڑا پیش کرتے اور مشکل کشائی کی دعائیں کرتے، کس طرح مجسم آرزو بن کر سرور کائناتؐ کی حضور میں امت کا احوال سناتے اور کرم کی بھیک مانگتے اور بے تابی اور بے چینی حد سے بڑھی تو ''شکوہ'' تک لکھ ڈالا، آج امت کا ہر فرد اپنے دل پر ہاتھ رکھ کر جواب دے کہ خدائے ذوالجلالؑ کی بے نیاز بارگاہ میں اقبال کے علاوہ کس نے اتنے وفور جذبات، اتنی جرات، اس قدر دردمندی اور سوز

دروں سے اس کا مقدمہ پیش کیا ہے؟ اس شکوے پر اقبال کو فتووں کے کتنے تیر و نشتر سہنے پڑے لیکن آرزو اور ارمان کا ایک ایک کانٹا دل سے نکال کر رکھ دیا۔

عہد اقبال میں یہ نہیں کہ فلسفی کوئی نہ تھا، صاحب قلم لوگ نہیں تھے، خطیب و ادیب ناپید تھے، دنیا شاعروں سے بانجھ ہو گئی تھی، صاحب درد اٹھ گئے تھے، یا اہل نظر مفقود تھے، سبھی لوگ تھے البتہ انہوں نے اپنے وقت کے خانے بنا رکھے تھے اور ایک خانہ ''امت'' کا تھا، مگر اقبال کا ہر لمحہ وقف امہ تھا، کبھی ماضی مرحوم ان کی آنکھوں کے سامنے آتا تو بڑی حسرت سے کہہ اٹھتے:

اے لا الا کے وارث باقی نہیں ہے تجھ میں
گفتار دلبرانہ، کردار قاہرانہ
تیری نگاہوں سے دل سینوں میں کانپتے تھے
کھویا گیا ہے تیرا جذب قلندرانہ

کبھی وہ افراد امت سے اس انداز میں مخاطب ہوتے ہیں:

تیرا اندیشہ افلاکی نہیں ہے
تری پرواز لولاکی نہیں ہے
یہ مانا اصل شاہینی ہے تیری
تری آنکھوں میں بے باکی نہیں ہے

کبھی اس زمین میں لہجہ بدل کر بات کرتے ہیں:

رگوں میں وہ لہو باقی نہیں ہے
وہ دل وہ آرزو باقی نہیں ہے
نماز و روزہ و قربانی و حج
یہ سب باقی ہے تُو باقی نہیں ہے

اقبالؒ جب امت کے ہاتھ میں کشکول گدائی دیکھتے ہیں اور چھوٹے چھوٹے

کاموں کے لیے غیروں کی طرف التجا بھری نظروں کا مشاہدہ کرتے ہیں تو پروانے اور جگنو کو استعارہ بنا کر اہل اسلام کو درس خودی دیتے ہیں، پروانہ کہتا ہے:

پروانے کی منزل ہے بہت دور ہے جگنو
کیوں آتش بے سوز پہ مغرور ہے جگنو

جگنو جواب دیتا ہے:

اللہ کا سو شکر، کہ پروانہ نہیں میں
دریوزہ گر آتش بیگانہ نہیں میں

مسلمانوں کے وقار اور اقتدار کی آخری علامت ''خلافت'' کی تحلیل کا جب باقاعدہ اعلان ہوتا ہے اور وہ بھی اپنے لوگوں کے ہاتھوں تو اقبالؒ چپ نہیں رہ سکتے۔

چاک کر دی ترک ناداں نے خلافت کی قبا
سادگی اپنوں کی دیکھ اوروں کی عیاری بھی دیکھ

امت کی زبوں حالی پر درد الفاظ کے قالب میں ڈھل جاتی ہے۔

ہو گئی رسوا زمانے میں کلاہ لالہ رنگ
جو سراپا ناز تھے، ہیں آج مجبور نیاز

امت آج بھی گوناگوں مصیبت اور دگرگوں حالت میں ہے، آج سب سے زیادہ معاشی بدحالی کا رونا رویا جاتا ہے اور اسے ''ام المسائل'' کا درجہ حاصل ہے، لیکن بخدا امت معاشی بدحالی کا شکار نہیں بلکہ ارباب اقتدار کی بداعمالی میں گرفتار ہے، امریکہ اور یورپ کے پٹھو حکمران اگر امت کی گردن سے کسی طرح اتر جائیں تو دنیا دیکھے گی سورہ رحمٰن کی ستائیس کی ستائیس نعمتیں قدرت نے امت کو عطا کی ہوئی ہیں، مسئلہ یہ ہے کہ امت میں ذوق یقیں پیدا ہو، روح انقلاب بیدار ہو، نسبت مصطفےؐ استوار ہو، نصب العین کی وضاحت ہو، خودی کی تلاش اور استحکام پر توجہ دی جائے حکیم الامت نے سب سے زیادہ انھی باتوں پر زور دیا ہے، اگر ہاتھ شل ہوں تو توپ کسی کام نہیں آتی، آنکھیں

اداس ہوں تو نظارے پھیکے لگتے ہیں، دل مردہ ہو تو کوئی آرزو پرورش نہیں پا سکتی، ذوق بگڑا ہوا ہو تو لاہوتی نغمہ بھی کانوں پر گراں گزرتا ہے، حکیم الامت اقبالؒ نے اس ہاتھ کو ''دست قدرت'' بنانے کی بات کی ہے، انہی آنکھوں میں چمک پیدا کرنے کی ضرورت پر زور دیا ہے، اسی دل کو تپش آشنا چاہا ہے، اور اسی ذوق کو درست کرنے کی تلقین کی ہے۔

نشان راہ ز عقل ہزار حیلہ پرس
بیا کہ عشق کمالے زیک فنی دارد

☆☆☆☆

نہ شیخ شہر، نہ شاعر، نہ خرقہ پوش اقبالؒ

ہمارے دیس میں تو ہر دوسرا شخص شیخ شہر بننے اور کہلانے کو بے تاب ہے لیکن اقبالؒ حکیم الامت ہونے کے باوجود اس دعوے سے گریزاں ہیں کہ وہ شیخ شہر ہیں، شاید اس لیے کہ یہاں جو بھی شیخ شہر دیکھا ہے اس لیے لہجے میں شیخی اور باتوں میں شوخی کے علاوہ کچھ نہیں ملتا، اس کی مسند کو غور سے دیکھا جائے تو آدھی سے زیادہ غریب کے پیرہن سے بنی ہوتی ہے، اس کی عبا پر پیوند کم اور داغ ندامت زیادہ نظر آتے ہیں، اس کی ساری کرامات کا دارومدار سرکار دولتمدار کی عنایات پر ہوتا ہے، شیخ شہر کو جب بھی دیکھو امیر شہر کی محفل میں نظر آئے گا، ''عبدہ'' کہلانے کی بجائے ''نقدہ'' کمانے کی فکر میں زیادہ سرگرداں رہتا ہے، اس کی وضع قطع سے خلوص کم اور ''فلوس'' زیادہ ظاہر ہوتا ہے، ایسے میں دانائے راز (اقبالؒ) کو کیا پڑی ہے کہ وہ شیخ شہر کہلوائے، اسی طرح شاعری کی تمام اصناف پر کامل عبور رکھنے کے باوجود اقبالؒ کو شاعر کہلانے سے وحشت ہوتی ہے، اس قدر وحشت کہ وہ حضورؐ سے فریاد کرتے نظر آتے ہیں۔

من اے میر امم داد از تو خواہم
مرا یاراں غزلخوانے شمردند

وہ صف شعراء میں بیٹھنے سے کیوں نفور اور نالاں ہیں، شاید اس لیے کہ شاعری تو ایک ''نعمت خداداد'' ہے اور یہاں ''صدارتی ایوارڈ'' سے منسلک ہو کر رہ گئی ہے، شاعری تو جزو پیغمبری ہے یہاں دریوزہ گری کی ہم قافیہ کیوں ہوگئی ہے؟ شاعری تو صور

اسرافیل کا آہنگ رکھتی ہے یہاں کاکل شب رنگ میں الجھ کر رہ گئی ہے، شاعری سے تو قومیں تیغ آبدار کا کام لیتی ہیں لیکن یہاں اس کا سارے کا سارا سرمایہ چشم سرگیں اور لب و رخسار ہے، فیلسوف مشرق آخر کیوں شاعر ہونے کی تہمت اپنے ذمے دھریں، اقبالؒ کو خرقہ پوش ہونے کا شوق بھی نہیں، جس خرقے کا اندرش اطلس وکم خواب ہو وہ چوغہ مکر تو ہو سکتا ہے خرقہ فقر ہرگز نہیں۔

اس لیے اقبالؒ ایسی خرقہ پوشی سے انکاری ہے۔

ہاں اگر شیخ وہ ہو جس کا عصا ہر سامری وقت کے لیے عصائے موسوی ثابت ہو تو پھر اقبالؒ سے بڑا ''شیخ وقت'' کوئی نہیں، اگرچہ شیخ تسبیح بدست نہ ہو تو پھر بھی راز الست فاش کر دے تو اقبالؒ کو شیخ ماننا پڑے گا، گو کہ شیخ مسند نشین نہ ہو مگر سدرہ نشین کا ہمراز ہو تو اقبالؒ کو شیخ کا لقب دینا پڑے گا، خواہ شیخ اونچی کلاہ نہ پہنتا ہو، لیکن خود آگاہ، خدا آشنا اور بلند نگاہ ہو تو اقبالؒ واقعی شیخ نظر آئے گا، چاہے شیخ باقاعدہ حلقہ ارادت نہ سجاتا ہو لیکن اس کے حلقہ سخن میں وہ گدا مستقل زیر تربیت ہوں جو شاہوں سے زیادہ رسم کجکلاہی جانتے ہوں تو اقبالؒ شیخ ہی نہیں شیخ اکبر کہلانے کا حق رکھتے ہیں۔

اقبالؒ کو تو وہ شیخ شہر بننا پسند نہیں جو زندگی گزارنا جانتا ہے زندگی سنوارنے کا گر نہیں بتاتا، جس کے پہلو میں دل تو ہے لیکن غمناک نہیں، آنکھیں تو ہیں لیکن نمناک نہیں، ''حق ہو'' کی ضرب تو مارتا ہے لیکن کسی کا لہو نہیں گرما پاتا، جو نانِ جویں تو کھاتا ہے لیکن بازوئے حیدری نہیں رکھتا، مراقبے کا ماہر ہے لیکن مشاہدے سے محروم ہے، باتیں بنانے کا ہنر تو رکھتا ہے لیکن ممولے کو شہباز سے لڑانے کا فن نہیں جانتا۔

اقبالؒ تو عمر بھر ایسے شیخ کا قائل اور مرید رہا ہے، جو کہتا ہے:

من آن علم و فراست با پرکاہے نمی گیرم

کہ از تیغ و سپر بیگانہ سازد مرد غازی را

بہ نرخے کہ ایں کالا بگیری سودمند افتد

بزور بازوئے حیدر بدہ ادراک رازی را
اگر یک قطرہ خوں داری اگر مشت پرے داری
بیا من با تو آموزم طریق شہبازی را

اقبالؒ مسلم الثبوت شاعر ہے، اقبالؒ کی اس حیثیت سے کون انکاری ہو سکتا ہے؟ اقبالؒ لاکھ کہیں:

کہ برمن تہمت شعر و سخن بست

اس کے باوجود کون اس پر یقین کرے گا، لیکن مسئلہ پھر وہی ہے کہ شاعری صرف بت تراشی کے لیے وقف نہ ہو بلکہ خارا شگافی پر ابھارنے والی ہو۔

ایک شاعری تو وہ ہے کہ محبوب کے رخسار کے تل پر سمرقند و بخارا بخشیش کیا جا رہا ہے اور:

من قبلہ راست کردم بر طرف کجکلا ہے

جیسے مصرعے موزوں کیے جا رہے ہیں اور کہیں جنس دو عالم کو قربان یک تبسّم جاناں نہ کیا جا رہا ہے، اور کبھی مشق ناز کے نتیجے میں خون دو عالم کا بوجھ اپنی گردن پر بخوشی لادا جا رہا ہے، اور کسی جگہ آہوان صحرا ہتھیلیوں پر اپنے سر سجائے شکاری کی تلاش میں ہیں، لیکن اقبالؒ جب آغازِ سخن کرتا ہے تو جہان دیگر کی خبر لاتا ہے۔

مرا با فقر سامان کلیم است
فر شاہنشہی زیر گلیم است
اگر خاکم بصحرائے نہ گنجم
اگر آبم بدریائے نہ گنجم
دل سنگ از زجاج من بلرزد
یم افکار من ساحل نہ ورزد
نہاں تقدیرہا در پردہ من

قیامت ہا بغل پروردۂ من

دمے در خویشتن خلوت گزیدم
جہانے لازوالے آفریدم
''مرا زیں شاعری خود عار ناید
کہ در صد قرن یک عطار ناید

شاعری اگر بیداری ملت کے لیے ہو، استحکام خودی کے لیے ہو، عرفان نفس اور خود آگہی کے لیے ہو، تو باعث عار اور موجب ننگ کیوں ہو؟

اس اعتبار سے اقبالؒ سے بڑا شاعر خاک ہند سے نہیں اٹھا، اقبالؒ نے شاعری سے بانگ درا کا کام لیا ہے، انھوں نے شاعری کو بال جبریل دے کر زمین و آسمان کے فاصلوں کو لمحوں کا سفر بنا دیا ہے۔

جس شاعری کو جزو پیغمبری اور جس کلام کو الہام کہا گیا ہے، اس کے بیشتر اور خوبصورت نمونے کلام اقبالؒ میں جا بجا ملتے ہیں، مثلاً:

نہاں اندر دو حرفے سر کار است
مقام عشق منبر نیست دار است
براہیماں زنمرودان نترسند
کہ عود خام را آتش عیار است

ایک اور مقام ملاحظہ ہو:

مسلمانے کہ داند رمز دیں را
نساید پیش غیراللہ جبیں را
اگر گردوں بہ کام او نہ گردد
بکام خود بہ گرداند زمیں را

یہ رنگ بھی دیکھنے کے لائق ہے:

قلندر میل تقریرے نہ دارد
بجز این نکتہ اکسیرے ندارد
ازاں کشت خرابے حاصلے نیست
کہ آب از خون شبیرے نہ دارد

اس شاعری پہ الہام کا گمان نہ گزرے تو اور کیا ہو۔

می شود پردہ چشم پرکاہے گاھے
دیدہ ام ہر دو جہاں را بہ نگاہے گاھے
وادی عشق بسے دور دراز است ولے
طے شود جادہ صد سالہ بہ آہے گاھے
در طلب کوش و مدہ دامن امید زدست
دولتے ہست کہ یابی سر راہے گاھے

غزل اس اعتبار سے بہت بدنام ہے کہ اس کا سارا لف ونشر گل وبلبل اور عارض وکاکل سے مرتب ہوتا ہے اقبالؒ نے بھی رنگ تغزل باندھا ہے لیکن اس میں وہ متانت اور بلندی ہے کہ اس کے سامنے غزل کی اباحیت شرما شرما جاتی ہے۔

موج را از سینہ دریا گسستن می تواں
بحر بے پایاں بجوئے خویش بستن می تواں
می تواں جبریل را کنجشک دست آموز کرد
شہپرش باموئے آتش دیدہ بستن می تواں
اے سکندر! سلطنت نازک تر از جام جم است
یک جہان آئینہ از سنگے شکستن می تواں
من فقیرے بے نیازم مشربم این است وبس
مومیائی خواستن نتواں، شکستن می تواں

اقبالؒ کو پڑھ کر یہ اندازہ بلکہ یقین ہو جاتا ہے کہ وہ شیخ وقت ہے اگرچہ تسبیح بدست نہیں اور شاعر ہفت زباں ہے گو کہ اسیر زلف بتاں اور مرید پیر مغاں نہیں۔

رہی یہ بات کہ "نہ خرقہ پوش اقبالؒ" تو اس سے مراد خرقہ پوشی سے عداوت نہیں بلکہ خرقہ پوشی کی آڑ میں کم کوشی سے نفرت ہے، جس طرح بادشاہ تاج کے بغیر نامکمل ہوتا ہے اسی طرح فقیر بھی خرقہ کے بغیر ادھورا ہوتا ہے، ہر خرقہ پوش فقیر نہیں ہوتا لیکن ہر صاحب فقر خرقہ پوش ہوتا ہے، اس کی گدڑی میں وہ وہ لعل و گہر ہوتے ہیں جو تاج شہی میں بھی نہیں ملتے، فقیر کو جو پوستین میں لذت یقین ملتی ہے وہ شاہوں کو کبھی خلعت ریشمیں میں بھی نصیب نہیں ہوتی، اقبالؒ کو اصرار صرف اس بات پر ہے کہ

نہ ہر کہ سر بتراشد قلندری داند

یعنی جو اچھی چائے بنانا اور پینا سیکھ لے ضروری نہیں کہ وہ ابوالکلامؒ بھی بن جائے، خرقہ دلیل فقر ہے اور اقبالؒ کا وجود فقر کے لیے حوالہ معتبر ہے، فقر کا تانا بانا بے نیازی، خود اعتمادی اور غیرت و معرفت سے تیار ہوتا ہے، اس لحاظ سے ہمارے ممدوح کی شخصیت ان چار عناصر ترکیبی سے بنی ہے۔

فقر غربت کا نام نہیں غیرت کا نام ہے، فقر حیلہ سازی نہیں بے نیازی ہے، فقر فریاد نہیں کرتا خود اعتماد بناتا ہے، اور فقر رہبانیت نہیں معرفت کا گر سکھاتا ہے، اقبالؒ کو جس فقر سے آگاہی ہے اور وہ جس منزل فقر کا راہی ہے تو پھر خرقہ فقر پہننے کا سب سے زیادہ حق دار اقبالؒ نظر آتا ہے۔

فقر کیا ہے؟ اقبالؒ سے پوچھیئے:

چیست فقر اے بندگان آب و گل
یک نگاہ راہ بیں یک زندہ دل
فقر خیبر گیر بانان شعیر
بستہ فتراک او سلطان و میر

گرچہ اندر بزم کم گوید سخن
یک دم او گرمئی صد انجمن
بے پراں را ذوق پروازے دہد
پشہ را تمکین شہبازے دہد
باسلاطیں درفتد مرد فقیر
از شکوہ، بوریا لرزد سریر
حکمت دیں دل نوازی ہائے فقر
قوت دیں بے نیازی ہائے فقر

ہمارا عنوان سخن تھا، نہ شیخ شہر، نہ شاعر نہ خرقہ پوش اقبالؒ۔ لیکن حقائق کی رو سے اقبالؒ شیخ وقت بھی نظر آتے ہیں، شعراء کے بھی صدر نشین ہیں اور خرقہ بھی قامت اقبالؒ پہ راست آتا ہے اور زیب دیتا ہے اس لیے اقبالؒ

فقیر راہ نشین است و دل غنی دارد

اقبالؒ فقر کو غلام قبا اور درویشی کو محتاج دلق و کلاہ نہیں سمجھتا، اس کے نزدیک ان کے بغیر بھی آداب فقر سے آگہی نصیب ہو سکتی ہے۔

اقبالؒ قبا پوشد درکار جہاں کوشد
دریاب کہ درویشی با دلق و کلاہے نیست

خرقہ پوشی کار دگر اور خرقہ فروشی چیزے دیگر! اقبالؒ اس فرق کو خوب سمجھتا ہے۔

بیا کہ دامن اقبالؒ را بدست آریم
کہ او از خرقہ فروشان خانقاہے نیست

☆☆☆☆

قائداعظمؒ اور ہم

دنیا میں بہت کم ایسی شخصیات گزری ہیں جنہوں نے بیک وقت کسی علاقے کے جغرافیہ اور قوم کی تاریخ کو بدل ڈالا ہو، انہیں کمیاب بلکہ نایاب اعاظم رجال میں ایک روشن اور نمایاں نام قائداعظم محمد علی جناحؒ کا ہے واقعہ یہ ہے کہ اگر قدرت حق ان جیسا مدبر، اور دور اندیش اور مستقل مزاج انسان منصۂ شہود پر نہ لاتی تو نجانے برصغیر ہند کے مسلمانوں کا کیا مستقبل ہوتا؟ اور وہ اس وقت کس حال میں ہوتے؟

قائداعظم بلاشبہ ایک معروف اور بہت اچھے وکیل تھے لیکن وہ مسلمانوں کے سب سے بڑے وکیل بن کر ابھرے، ان کا لباس انتہائی صاف ستھرا ہوتا تھا لیکن ان کا دماغ اس سے بھی زیادہ پاکیزہ اور اجلا تھا، ان کا قد بلند و بالا تھا لیکن اس کی سوچ اور بھی زیادہ اونچی تھی، اسی اچھی وکالت، اجلے ذہن اور بلند سوچ نے برصغیر کے مسلمانوں کا بھلا کر دیا اور ان کی آزادی کا سامان ہو گیا۔

بعض حالات اور وجوہ کی بناء پر ہندو دیگر معاملات کے ساتھ ساتھ قیادت کے باب میں بھی خاصے خود کفیل اور متمول تھے، گاندھی نہیں تو نہرو تھا، وہ نہ ہوتے تو راج گوپال اچاریہ تھے، وہ نہ سہی تو پٹیل موجود، اور بھی کئی تھے، مگر مسلمانوں میں اس پائے کا انسان صرف ایک تھا یعنی محمد علی جناحؒ۔ جس کے ہاتھ سے خطۂ ہند کے دس کروڑ مسلمانوں کے جذبات کی کنجی تھی، ان کا ایک اشارہ کروڑوں مسلمانوں کے احساسات کا ترجمان بن گیا تھا، برطانوی صحافی بیورلے نے قائداعظمؒ سے ملاقات اور انٹرویو

کے بعد کہا تھا۔

''آئندہ سیاست کا انجام اس یک چشمہ کے ریشمی دھاگے سے لٹک رہا ہے''

دنیا بھر میں یوں تو بے شمار تحریکیں بر سر عمل ہوتی ہیں اور انقلاب کے منہ زور دھارے رونما ہوتے رہتے ہیں مگر بعض اوقات دور اندیش قیادت، فکری یکسوئی، حتمی قوت فیصلہ اور اپنے پروگرام کی صراحت اور صداقت پر اعتماد کے فقدان کی وجہ سے مثبت تبدیلی رونما نہیں ہوتی، اس معاملے میں بانی پاکستان اپنے پروگرام کے حوالے سے اتنے یکسو اور پر اعتماد تھے کہ دنیا کی نظر میں سورج اپنے طلوع وغروب کا شیڈول تو بدل سکتا ہے لیکن وہ اپنی رائے کسی مصلحت اور دباؤ کے باعث بدلنے کا سوچ بھی نہیں سکتے تھے، ''یاروں'' نے اسے ہٹ دھرمی کا نام دیا مگر اہل نظر اسے بھر پور اخلاص اور کامل اعتماد کا عنوان دیتے ہیں۔

بیورلے نے ایک بار پوچھا تھا ''پاکستان بننے سے مسلمان امیر بنیں گے یا غریب؟''

قائداعظم نے جواباً کہا تفریح طبع کی خاطر مجھے سوال کرنے دیجئے، فرمایئے جرمنی کے زیر تسلط خوشحال انگلستان اچھا رہے گا یا آزاد مگر غریب انگلستان؟''

بیورلے نے مسکرا کر کہا ''جواب بڑا واضح ہے کہنے کی کیا ضرورت ہے؟

یہ مکالمہ اپنے پروگرام کی قطعیت اور اصابت رائے کا زبردست مظہر ہے، ظاہر ہے جس کی سمت سفر اتنی واضح اور راست ہو اس کی منزل کیسے کھوٹی ہو سکتی ہے؟

دو قومی نظریے کے بارے میں گاندھی نے ایک خط میں اس نظریے کو جھٹلاتے ہوئے قائداعظمؒ سے ایک استفسار کیا تھا، آپ نے جواب میں گاندھی کے دلائل کو مسترد کرتے ہوئے لکھا۔

''ہمارا دعویٰ ہے کہ لفظ ''قوم'' کی کوئی بھی تعریف کی جائے ہندو اور مسلمان دو الگ الگ قومیں ہیں ہم محض کثرت آبادی کے اصول پر بھی ایک علیحدہ قوم کہلوانے کے

حقدار ہیں کیوں کہ ہماری تعداد دس کروڑ ہے مزید برآں ہماری قوم ایک نمایاں تہذیب وتمدّن کی وارث ہے، ہماری ادبیات، ہماری ترکیب تسمیہ، ہمارے اسماء، ہمارے فنون، ہمارا طرز تعمیر، ہمارا کردار، ہمارے طبائع، ہمارا قانون، ہمارا ضابطۂ اخلاق، ہمارا رسم و رواج، ہماری تقویم، ہماری تاریخ، ہمارے ہیرو، ہماری روایات، ہمارے فطری رجحانات، ہمارے قومی مقاصد غرض زندگی اور طرز زندگی کا ہر زاویہ ہمارے علیحدہ قوم ہونے کا منہ بولتا ثبوت ہے'' (جناح بنام گاندھی، 17 ستمبر 1944ء)

آپ نے ملاحظہ فرمایا کہ اپنے موقف کے حوالے سے کوئی ایچ پیچ؟ کوئی شک شبہ؟ کوئی تزلزل؟ یا کوئی خدشہ؟ یہ مستحکم دلیل ایک مستحکم نصب العین کی بنیاد ٹھہری، اس وقت ہمار مسئلہ بلکہ سب سے بڑا مسئلہ ہماری بے اعتمادی اور اپنے موقف کے بارے میں تشکیک ہے بانی پاکستان نے جس خود اعتمادی کے ساتھ سفر شروع کیا تھا بد قسمتی سے ہم اہالیان پاکستان اسی درجے کی بے حوصلگی کا شکار ہو چکے ہیں۔

اس وقت میں برادران وطن کی توجہ اپنے رہبر کی دو باتوں کی طرف دلاؤں گا، اور ہمیں غور کرنا چاہیے کہ کیا ہم ان کی روشنی میں کچھ کر سکتے ہیں یا طے کر رکھا ہے کہ جتنی بار قائداعظم کا نام لیں گے اتنی ہی بار ان کی سوچ کی تکذیب کریں گے۔

(قائداعظم اور غریب عوام)

قائداعظم کے نزدیک اگرچہ آزادی سب سے بڑی نعمت ہے خواہ اس کے ملنے پر فاقے کیوں نہ برداشت کرنے پڑیں تاہم اس کا یہ ہرگز مطلب نہیں کہ آزادی معاشرے کو دو طبقوں میں بانٹ کر رکھ دے۔ ایک وہ جو کھا کھا کر بیمار ہوں اور دوسرے جو فاقوں سے نڈھال ہوں، اسی لیے بانی پاکستان نے ایک موقع پر کہا تھا۔

''پاکستان غریبوں کی قربانیوں سے بنا ہے یہ غریبوں کا ملک ہے اور اس پر غریبوں کو ہی حکومت کا حق ہے۔ پاکستان میں ہر شخص کا معیار زندگی اتنا بلند کیا جائے گا کہ غریب اور امیر میں کوئی فرق نہیں رہے گا پاکستان کا اقتصادی نظام اسلام کے قانونی

اصولوں کے مطابق ہوگا جس نے غلاموں کو تخت و تاج کا مالک بنا دیا۔ پاکستان میں غریب اور امیر دونوں کے لیے مواقع یکساں ہوں گے“

سوچنے کی بات یہ ہے کہ آج غریب عوام اس ملک کے مالک تو کجا اس کے معزز شہری بھی سمجھے جاتے ہیں؟ اور کیا ان کے لیے بھی زندگی کی جدوجہد میں برابر کے مواقع موجود ہیں؟ ظاہر ہے جواب انتہائی ندامت کے ساتھ نفی میں ہے، بانی پاکستان نے واقعی ملک، غریب عوام کی غیر مشروط حمایت اور غیر متزلزل جدوجہد کے باعث حاصل کیا تھا اور ہماری نصف صدی کی تاریخ میں غالباً وہ واحد موقع تھا جب ہمارے معاشرے میں دونوں طبقات کو یکساں اہمیت حاصل رہی، وگرنہ بعد کے واقعات نے اس تاثر کو بہت گہرا کر دیا ہے کہ ملک کے اصل شہری مراعات یافتہ لوگ ہیں اور باقی کروڑوں عوام دوسرے درجے کی مخلوق ہیں نہ جن کے کوئی معاشی حقوق ہیں اور نہ کوئی معاشرتی رتبہ!

وطن عزیز میں کئی حکومتیں بدلیں، چہرے بدلے، اس کھینچ تانی میں ہمارا جغرافیائی نقشہ بدل گیا مگر عوام کی قسمت ابھی تک نہیں بدلی، جتنی اسمبلیاں بنیں، اور جتنی حکومتیں قائم ہوئیں یہ سب کچھ ہوا تو عوام کے ووٹوں کے باعث مگر تحفظ صرف اپنی ذات اور اپنے طبقات کا کیا، نصف صدی کوئی معمولی مدت نہیں کسی منصوبہ بندی سے کام کیا جاتا اور اس میں اخلاص شامل ہوتا تو آج ملک میں نہ کوئی جاہل ہوتا، نہ بے روزگار اور نہ مریض، اگر کروڑوں روپے حکومتی ایوانوں اور نجی بنگلوں پر خرچ ہو سکتے ہیں تو عوام کے لیے رہائش کا بندوبست کیوں نہیں ہو سکتا؟ اگر کثیر رقوم حکمرانوں اور نواب زادوں کے عیش و آرام پر اٹھ سکتی ہیں تو لوگوں کے نان نفقہ کا انتظام کیوں نہیں ہو سکتا؟ اگر کچھ لاڈلے ایچی سن اور آکسفورڈ میں داخلہ لے سکتے ہیں تو عوام کے لیے بنیادی تعلیم کا اہتمام کیوں نہیں ہو سکتا؟ ہمارے قومی رہنماؤں کے پاس اتنی جائیداد ہے کہ اس کی منصفانہ تقسیم ہو تو کوئی پاکستانی بے زمین، بے گھر اور در بدر نہیں رہ سکتا، یوں لگتا ہے کہ

ہم نے ارضِ وطن کو کچھ گھرانوں کی فلاح و بہبود کے لیے وقف کر رکھا ہے۔ رہے عوام تو ان کے مقدر میں غلامی رہ گئی ہے خواہ پردیسوں کی ہو یا دیسوں کی، گورا بہادر ہو یا کالا بہادر!

وطنِ عزیز کئی صدموں اور جھٹکوں سے دوچار اور سیاسی طور پر عدمِ استحکام کا شکار ہوا ہے، کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ ملک توڑنے کے کسی منصوبے میں عام آدمی کا ہاتھ تھا؟ کچھ خفیہ فنڈز اس کے ہاتھ میں رہے ہیں؟ کسی غیر ملکی طاقت سے گٹھ جوڑ کیا ہے؟ ہرگز نہیں، عام آدمی جیتا بھی اسی ملک میں ہے، بیمار ہو تو علاج بھی یہیں کراتا ہے، مر جائے تو اپنی ہی مٹی میں دفن ہوتا ہے، بھوکا رہے یا پیاسا، اس کا دکھ سکھ اسی سرزمین سے وابستہ ہے، عام آدمی کی نظریں اٹھتی ہیں تو اسی دیار کے در و دیوار سے ٹکراتی ہیں اسے روس، بھارت یا امریکہ سے کیا واسطہ؟

غیروں کی وکالت اور دلالی تو وہی کرتے ہیں جو ملک کے سیاہ و سفید کے مالک بنے ہوئے ہیں، آخر قائداعظم ؒ نے یہ کیوں کہا تھا کہ ملک کے اصل مالک غریب ہیں جبکہ عملاً ایسا نہیں، اربابِ فکر و نظر اور اصحابِ ایوان و اقتدار پر لازم ہے کہ وہ قائد کی فکر کو عمل کے سانچے میں ڈھالیں۔

(وحدت اسلامی)

بانی پاکستان نے جب تحریکِ پاکستان کی زمام سنبھالی تو اس وقت بلاتخصیص رنگ و نسل اور فرقہ و جماعت کے تمام مسلمانوں نے ان کی رہنمائی میں کام کیا اور خود قائداعظم ؒ کو احساس تھا کہ یہ فکری اجماع اور مشترکہ جدوجہد کسی بنگالی، پٹھان، پنجابی، سندھی اور سنی، شیعہ اور مقلد و غیر مقلد کی نہیں بلکہ مسلمانوں کی ہے، خواہ کوئی بمبئی کا ہے یا پشاور کا، اردو بولنے والا ہے یا پنجابی، اس لیے انہوں نے اس بنائے اتحاد کو مضبوط کرنے پر زور دیا، انھوں نے کہا۔

''وہ کون سا رشتہ ہے جس میں منسلک ہونے سے تمام مسلمان جسدِ واحد کی طرح

ہیں وہ کون سی چٹان ہے جس پر ان کی ملت کی عمارت استوار ہے وہ کون سا لنگر ہے جس سے اس امت کی کشتی محفوظ کر دی گئی ہے وہ رشتہ وہ چٹان وہ لنگر اللہ کی کتاب قرآن مجید ہے، مجھے یقین ہے کہ جوں جوں ہم آگے بڑھتے جائیں گے ہم میں زیادہ سے زیادہ اتحاد ہوتا جائے گا، ایک اللہ، ایک رسول، ایک کتاب اور ایک امت''

مشرقی پاکستان کے الگ ہو جانے کے بعد کیا ہم کہہ سکتے ہیں کہ قوم نے اپنے محسن کے اقوال کو مناسب اہمیت دی؟ بانی پاکستان خوب سمجھتے تھے کہ مسلمان ایک امت ہیں نہ کہ امت در امت کا مکروہ سلسلہ! سنی الگ امت ہوں اور دوسرے فرقے الگ ملت، اور آئے روز ایک دوسرے کو دائرہ اسلام سے خارج کرنے کے مطالبے داغے جائیں، ایک صحافی نے قائد اعظمؒ سے پوچھا تھا کہ آپ شیعہ ہیں یا سنی؟ انہوں نے کہا ''نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سنی تھے یا شیعہ؟ صحافی نے لاجواب ہوتے ہوئے کہا '' وہ ان بکھیڑوں سے پاک تھے، قائد نے کہا میرا مسلک وہی ہے جو پیغمبر کا تھا، اہل سیاست نے بھی کچھ کم ستم نہیں ڈھائے لیکن ارباب منبر و محراب کا رویہ اونٹ کی کمر پر آخری تنکا معلوم ہوتا ہے بھانت بھانت کی بولیاں، رنگ رنگ کے مطالبے، نوع بہ نوع جلسے، اور نوع بہ نوع عقیدے، جبکہ اس تمام کش مکش کے باوجود سبھی کا موقف یہی ہے کہ سب کا اللہ، رسول، کتاب اور کعبہ ایک ہے مگر ایک امت کا تصور کمزور پڑ رہا ہے۔ کیا یہ امر واقعہ نہیں کہ بانی پاکستان مسلکاً شیعہ تھے مگر ان کی قیادت میں مولانا شبیر احمد عثمانی (دیو بندی) پیر صاحب مانکی شریف (بریلوی) مولانا محمد داؤد غزنوی (اہلحدیث) سبھی نے مل کر کام کیا، 53ء کی تحریک ختم نبوت کے قائد مولانا ابوالحسنات قادری (بریلوی) تھے اور ان کے شانہ بشانہ سید عطاء اللہ شاہ بخاری (دیو بندی) مولانا داؤد غزنوی (اہلحدیث) اور حافظ کفایت حسین (شیعہ) کام کرتے رہے۔

74ء کی تحریک ''ختم نبوت'' کے سالار مولانا محمد یوسف بنوری (دیو بندی) تھے اور اس قافلے میں مولانا عبدالستار خاں نیازی، مولانا مفتی محمود، مولانا احسان الٰہی ظہیر

اور مظفر علی شمسی سبھی لوگ شامل تھے جو الگ الگ مسلک رکھتے تھے، جب ہم اپنے محسنوں کے اقوال دہراتے ہیں اگر ان کا کوئی معنی یا مفہوم نہیں ہوتا تو دہرانے اور سنانے کا کیا مطلب؟ قائداعظمؒ اور اس وقت کی مسلم لیگ نے ایک واضح منشور کے ذریعے پاکستان کی جنگ جیتی تھی، الٹ پلٹ پروگرام کوئی بڑی تبدیلی نہیں لاتے صرف چہرے بدل جاتے ، ہیں اور چہرے بدلنے کی اس بے معنی مشق سے قوم اکتا چکی ہے، آج پھر قائداعظمؒ جیسا چہرہ درکار ہے جس پر فرقہ وارانہ خشونت نہ ہو، اور ماتھے پر صوبائی، علاقائی اور لسانی شکنیں ابھری ہوئی نہ ہوں، جس کی آنکھوں میں اعتماد کی لکیریں ہوں اور جس کی زبان پر محبت کے نغمے ہوں، جس کے ہر لفظ کا ایک واضح معنی ہو، اور جس کے ہر اشارے میں معنویت ہو، قائداعظمؒ ہمارے محسن تھے، ہمارے رہنما تھے، گو کہ وہ ارباب جبہ و دستار نہ تھے، خطیب و واعظ نہ تھے، شیخ و مفتی نہ تھے، مگر ان کا سب سے بڑا احسان یہ ہے کہ انہوں نے مسلمانوں کو امت واحدہ کے تصّور سے بہرہ ور کر دیا تھا۔ٹھیک انہی خطوط پر جن کی رہنمائی ہادی برحقؐ نے فرمائی تھی۔

خدا کرے ایک اور ایسا دانائے راز اس خاک سے اٹھے جو ہر طرح کے گروہی تعصّبات کو ہمیشہ کے لیے پیوند خاک کر دے۔

☆☆☆☆

شہید محبت

علامہ اقبالؒ کا ایک مصرعہ ہے:

طے شود جادۂ صد سالہ بآہے گاہے

یعنی بعض اوقات ایک آہ کے فاصلے پر منزل ہوتی ہے یا لمحے بھر میں سو سال کا سفر طے ہو جاتا ہے۔ یہ مصرعہ زبان پر آتے ہی ذہن بے اختیار شہید ناموس نبیؐ غازی علم الدینؒ کی طرف منتقل ہو جاتا ہے۔ اس نے صدیوں کا سفر اس تیزی اور کامیابی سے طے کیا کہ ارباب زہد و تقویٰ اور اصحاب منبر و محراب بس دیکھتے ہی رہ گئے۔ اس نے ایک قدم انارکلی ہسپتال روڈ پر اٹھایا اور دسرے قدم پر جنت الفردوس میں پہنچ گیا۔

یہ نصیب اللہ اکبر لوٹنے کی جائے ہے

اسی جنت کی تلاش میں زاہدوں اور عابدوں کے نجانے کتنے قافلے سرگرداں رہے۔ کیسے کیسے لوگ غاروں کے ہو کر رہ گئے۔ کئی پیشانیاں رگڑتے اور سر پٹختے رہے۔ ہزاروں سر بگریباں چلہ کش اسی آرزو میں دنیا سے اٹھ گئے۔ لاکھوں طواف و سجود میں غرق رہے۔ بے شمار صوفی و ملا وقف دعا رہے۔ ان گنت پرہیز گار خیال جنت میں سرشار رہے، خدا ان سب کی محنت ضرور قبول کرے گا، لیکن غازی علم الدینؒ کا مقسوم دیکھئے نہ چلّہ کیا، نہ مجاہدہ، نہ حج کیا، نہ عمرہ، نہ دیر میں قشقہ کھینچا، نہ حرم کا مجاور بنا، نہ مکتب میں داخلہ لیا، نہ خانقاہ کا راستہ دیکھا، نہ کنز قدوری کھول کر دیکھی، نہ رازی و کشاف کا مطالعہ کیا، نہ حزب البحر کا ورد کیا، نہ اسم اعظم کا وظیفہ پڑھا، نہ علم و حکمت

کے خم و پیچ میں الجھا، نہ کسی حلقہ تربیت میں بیٹھا، نہ کلام و معانی سے واسطہ رکھا نہ فلسفہ و منطق سے آشنا ہوا، نہ مسجد کے لوٹے بھرے، نہ تبلیغی گشت کیا، نہ کبھی شیخی بگھاری، نہ کبھی شوخی دکھائی، اسے پاکبازی کا خبط نہیں محبوب حجازیؐ سے ربط تھا، وہ تسبیح بدست نہیں مست مئے الست تھا، وہ فقیہ مسند آراء نہیں فقیر سر راہ تھا، یہی وجہ ہے کہ اس نے مصلحت کشی سے نہیں جذبہ درویشی سے کام لیا۔ چنین و چناں کے دائروں سے نکل کر کون و مکاں کی وسعتوں میں جا پہنچا، وہم و گمان کی خاک جھاڑ کر ایمان و عشق کے نور میں ڈھل گیا۔ نجانے ہاتف غیب نے چپکے سے اس کے کان میں کیا بات کہی کہ پل بھر میں دل کی کائنات بدل گئی۔

پروانے کا حال اس محفل میں ہے قابل رشک اے اہل نظر
اک شب میں ہی یہ پیدا بھی ہوا، عاشق بھی ہوا اور مر بھی گیا

خدا معلوم کتنی ریاضت سے آغوش بطام نے بایزیدؒ کی پرورش کی۔ خاک بغداد نے جنیدؒ کو جنم دیا۔ شہر قونیہ نے مولانا رومؒ کو بنایا، دہلی نے شاہ ولی اللہؒ کو پیدا کیا، اور ادھر علم الدینؒ بڑھئی کی دکان سے اٹھا اور ایک ہی جست میں زمان و مکاں طے کر ڈالے۔

علامہ اقبالؒ کو جب غازی علم الدینؒ کے بارے میں بتایا گیا کہ ایک اکیس سالہ ان پڑھ اور مزدور پیشہ نوجوان نے گستاخ رسول راج پال کو بڑی جرات اور پھرتی سے قتل بلکہ واصل جہنم کر دیا ہے تو حضرت علامہؒ نے گلوگیر لہجے میں فرمایا:

"اسی گلاں ای کردے رہ گئے تے ترکھاناں دا منڈا بازی لے گیا"
(ہم باتیں ہی بناتے رہے اور بڑھئی کا بیٹا بازی لے گیا)

حضرت علامہؒ نے غالباً اسی موقع کے لئے کہا ہے:

عشق کی اک جست نے طے کر دیا قصہ تمام
اس زمین و آسماں کو بے کراں سمجھا تھا میں

جس زمانے میں یہ رسوائے زمانہ کتاب لکھی اور چھاپی گئی، شہر لاہور میں ظاہر ہے حق ہو کے زمزمے ہوں گے، علم و فضل کے چرچے ہوں گے، تقریر و تحریر کے ہمہمے ہوں گے۔ وعظ و نصیحت کے غلغلے ہوں گے۔ ادیبوں اور خطیبوں کے طنطنے ہوں گے، لیکن شاتم رسول کو اسفل السافلین میں پہنچانے کی سعادت کی صوفی با صفا، کسی امام ادب و انشاء، کسی خطیب شعلہ نوا، اور کسی سیاسی رہنما کے حصے میں نہیں آئی، بلکہ ایسے مزدور کو ملی جو ممتاز دانشور نہیں معمولی کاریگر تھا۔ جس کی پیشانی پر علم و فضل کے آثار نہیں ہاتھوں میں لوہے کے اوزار تھے۔ خدا معلوم وہ نمازی تھا یا نہیں لیکن صحیح معنوں میں غازی نکلا، وہ کلاہ و دستار کا آدمی نہیں تھا مگر بڑے کردار کا حامل بن گیا۔

غازی علم الدین شہیدؒ کو دیکھ کر کم از کم یہ یقین ضرور ہو جاتا ہے کہ خدا تعالیٰ کسی کی عبا و قبا کے طول و عرض پر نہیں جاتا بلکہ کسی کے جذبہ بے غرض کو شرف قبولیت بخشتا ہے۔ اس کے ہاں شب زندہ داری سے زیادہ دل کی بے قراری کام دیتی ہے۔ وہ کسی کے ماتھے کا محراب نہیں دیکھتا، نہاں خانہ قلب کا اضطراب دیکھتا ہے، اسے نیکیوں کے سفینے نہیں گوشہ چشم پر آنسوؤں کے نگینے درکار ہوتے ہیں، اسے کسی کی خوش بیانی متاثر نہیں کرتی کسی کی بے زبانی پہ پیار آ جاتا ہے، اسے بوعلی کی حکمت کے مقابلے میں کسی بڑھئی کی غربت پسند آ جاتی ہے، اگر یہ بات نہ ہوتی تو غازی علم الدینؒ کبھی مقام شہادت سے سرفراز نہ ہوتا۔

کسی غزوے کے دوران ایک شخص حضورؐ کے دست مبارک پر مسلمان ہوتا ہے اور ساتھ ہی جہاد کی اجازت مانگتا ہے، چند لمحے قبل وہ سپاہ کفر میں شامل تھا، دو ساعتوں کے بعد وہ مجاہدین اسلام کا ساتھی بن جاتا ہے، دولت اسلام سے بہرہ مند اور جذبہ جہاد سے سرشار ہو کر میدان میں اترتا ہے اور تھوڑی دیر بعد جام شہادت نوش کر جاتا ہے، جنگ کے خاتمے پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم شہداء کی لاشوں کا معائنہ فرما رہے تھے جب ثابت بن امیرمؓ کی لاش پر پہنچے تو آپ نے صحابہؓ سے مخاطب ہو کر فرمایا ”اس شخص

کو دیکھو جس نے اسلام قبول کیا مگر نہ نماز پڑھی نہ اس نے روزہ رکھا، نہ اسے حج کرنے کا موقع ملا، مگر سیدھا جنت میں پہنچ گیا۔

یہی حال غازی علم الدین شہیدؒ کا ہے۔ نہ اس نے فن تجوید وقرات سیکھا، نہ عربی، فارسی پڑھی، نہ رومیؒ کی مثنوی دیکھی، نہ زمخشری کی کشاف پڑھی، نہ دین کے اسرار و رموز سمجھے مگر ایک راز اس پر ایسا کھلا کہ مقدر کے بند کواڑ کھل گئے۔ قسمت کا دریچہ کیا کھلا کہ جنت کے دروازے کھل گئے، یہ عقل خودبیں کا کرشمہ نہیں عشق خدا بیں کا معجزہ تھا، کل تک دکان پر ٹھک ٹھک کرنے والا علم الدین آج کروڑوں مسلمانوں کے سینے میں دل بن کر دھک دھک کر رہا ہے۔

غریب باپ کو کیا علم تھا کہ اس کی گود میں شہر محبت کا امیر پل رہا ہے، کچے گھروندے کو کیا خبر تھی کہ اس کے احاطے میں پکے عقیدے کا بچہ چل پھر رہا ہے، سنسان حویلی کو کیا پتہ تھا کہ ایمان کی دولت اس کے دامن میں بھری ہوئی ہے، محلّہ چابک سوار کا علم الدین میدان عشق کا شہسوار نکلا

یہ رتبہ بلند ملا جس کو مل گیا

غازی علم الدین شہید 1908ء میں پیدا ہوئے اور 31، اکتوبر 1929ء کو تعزیز جرم عشق میں پھانسی پا کر ہمیشہ کے لئے گستاخان رسول کے گلے کی پھانس بن گئے۔

21، برس کی عمر میں صدیوں کا سفر اس خوبی سے طے کیا کہ اس کی گرد سفر کا ایک ایک ذرہ کاروان شوق کے لئے نشان منزل بن کر رہ گیا ہے۔ نجانے عشاق کے اور کتنے قافلے اس راہ سے گزریں گے، لیکن ان پر لازم ہو گا کہ وہ علم الدینؒ کے نقش کف پا کو چوم کر اپنی منزل کی بو سونگھیں۔ لوگ زندہ جاوید ہونے کی آرزو میں مرمر کے جیتے اور جی جی کر مرتے ہیں، انہیں جینے کا فن تو آ جاتا ہے مرنے کا ڈھنگ نہیں جانتے وہ غازی علم الدینؒ کی روح سے پوچھیں کہ مر کر امر ہو جانے کا کیا راز ہے؟ فنا کے گھاٹ اتر کر لافانی بننے کا کیا طریقہ ہے؟ گمنام ہو کر شہرت دوام پانے کا کیا نسخہ ہے؟ کسی

کے نام پر مٹ کر انمٹ ہونے کی رمز کیا ہے؟ جام شہادت کے ذریعے آب حیات پینے کا کیا گر ہے؟

غازیؒ کو میانوالی جیل میں پھانسی دی گئی اور وہیں دفن بھی کر دیا گیا، انگریز کا خیال تھا کہ اگر لاش برسر عام لاہور لائی گئی تو ضبط کے سب بندھن ٹوٹ جائیں گے، مگر مسلمانوں کا احتجاج پورے برصغیر میں شدید سے شدید تر ہو گیا۔ حکیم الامت علامہ اقبالؒ، سر محمد شفیع، میاں عبدالعزیز مالواڈہ اور مولانا غلام محی الدین قصوری گورنر سے ملے اور غازیؒ کی لاش مسلمانوں کے حوالے کرنے کا مطالبہ کیا۔ بالآخر 14، نومبر کو لاش لاہور پہنچی، جنازہ چوبرجی جنازہ گاہ میں پہنچا، وہاں جنازہ کیا پہنچا پورا لاہور پہنچ گیا، اس اعزاز و تکریم کو شہنشاہ ہند ظہیر الدین بابر، مغل اعظم شاہجہاں، غیاث الدین بلبن اور دوسرے سلاطین جہاں آج تک ترستے ہوں گے، جو اکرام و اعزاز ''ترکھاناں دے منڈے'' کو نصیب ہوا۔

عاشق کا جنازہ ہے ذرا دھوم سے نکلے

غازیؒ آج قبرستان میانی صاحب میں آسودۂ خاک ہے اس خاک کا ہر ذرہ سرمہ چشم عشاق ہے۔ لوگ بقائے دوام پانے کے لئے خضر کی تلاش میں ہیں جو انہیں چشمہ حیواں تک پہنچا سکے، وہ سمجھتے ہیں کہ آب حیات کے دو گھونٹ انہیں حیات جاودانی بخش دیں گے لیکن انہیں معلوم نہیں کہ حضورؐ کے تلووں کا دھوون ہی آب حیات ہے اس کا ایک قطرہ حیات ابد عطا کر دیتا ہے۔ علم الدینؒ اپنے دم خم سے نہیں انہی کی کاک قدم بن کر زندہ و پائندہ رہے۔

ثبت است بر جریدۂ عالم دوام

☆☆☆☆

شاہ عبدالعلیم صدیقیؒ ۔۔ پاکستان کے عاشق حقیقی

''اے غلاموں کے سر پر تاج عزت رکھنے والے، بے پناہوں کو پناہ دینے والے، سن لے، سن لے، ہم بیکسوں، بے بسوں کی سن لے، ہم سیاہ کاروں کے سبب اپنے دین کو بدنام نہ ہونے دے، دین کی عزت رکھ لے، ہم کو سرنگوں نہ ہونے دے، ہمیں قوت دے، ہمیں طاقت دے، عزت دے، حمیت دے، غیرت دے، برصغیر ہند میں جو چھوٹی سی آزاد، خود مختار پاکستانی حکومت تو نے محض اپنے فضل سے عطا فرمائی ہے اس کی حفاظت فرما، اسے قوی سے قوی تر بنا اور صحیح معنی میں اسلامی دولت، اسلامی سلطنت اور الٰہی مملکت بنا، جہاں تیرا قانون، تیرے احکام جاری ہوں، تیرے دین کا علم بلند ہو، اور تیرے نام کا ابدالاباد تک بول بالا رہے، مولیٰ، مولیٰ، اے رحم و کرم والے مولا! ہماری دعائیں قبول کر''

مندرجہ بالا الفاظ دعائیہ ہیں اور یہ دعا ایک بے تاب تمنا کی صورت میں حضرت مولانا شاہ عبدالعلیم صدیقی میرٹھیؒ کے ہونٹوں پر مچلی ہے، اور یہ دعا ان کی ایک کتاب ''ذکر حبیبؐ'' سے لی گئی ہے۔

یہ دعائیہ الفاظ کئی لحاظ سے لائق توجہ اور حامل اہمیت ہیں، لفظوں کا در و بست، اور جملوں کی ساخت پتہ دے رہی ہے کہ دعا کرنے والا شخص ایک عالم بے خودی اور جہان محویت میں ہے جہاں دعا کرنے والے اور دعا سننے والے کے درمیان کوئی حجاب حائل نہیں، دعا گو کی روح دعا کے قالب میں پوری طرح ڈھل چکی ہے، بندے کے

پاس اپنے مولا کے لیے، جس قدر عاجزی، بے کسی، محتاجی، بے چارگی اور بے نوائی کے جذبات ہو سکتے ہیں وہ کاسۂ دعا میں رکھ کر دعا گو نے اپنے مولا، اپنے قاضی الحاجات اور اپنے مجیب الدعوات کے حضور پیش کر دیئے ہیں، بھیک مانگنے کا یہ انداز داتا کو ہمیشہ پسند آیا ہے، لیکن اس دعا کا ایک پہلو انتہائی توجہ طلب ہے، کہ ایسے موقع پر جب بندہ اپنے آپ کو خود سپردگی کے آخری نقطے پر پہنچا دیتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کی دعا کو بھی شانِ قبولیت عطا فرما دیتا ہے، کوئی بندہ ایسی کیفیت میں چاہے تو اپنے لیے، اپنی ذات کے لیے، اپنی اولاد کے لیے وہ کچھ مانگ سکتا ہے اور اسے وہ کچھ مل سکتا ہے، جو اس سے پہلے بندے نے نہیں مانگا تھا اور مولا آج اسے دینے پر آمادہ ہے، مگر مولانا شاہ عبدالعلیم صدیقیؒ نے ایسے موقع پر نہ اپنے لیے کچھ طلب کیا اور نہ اولاد کے مستقبل کے لیے طمع کیا ہے بلکہ جو کچھ مانگا ہے پیارے پاکستان کے لیے مانگا ہے، دعا کے ان لمحات میں اگر مولانا کا سر اظہارِ عجز کے لیے بارگاہ ایزدی میں جھکا ہے تو پاکستان کے لیے، ہونٹ کپکپائے ہیں تو پاکستان کے لیے، آنکھوں کے گوشے نم ہوئے ہیں تو پاکستان کے لیے، ہاتھ اٹھے ہیں تو پاکستان کے لیے، دامن پھیلا ہے تو پاکستان کے لیے، جسم پر لرزہ طاری ہوا ہے تو پاکستان کے لیے، جملوں میں بے بسی سمائی ہے تو پاکستان کے لیے، لفظوں میں تڑپ پیدا ہوئی ہے تو پاکستان کے لیے اور آواز بھرائی ہے تو پاکستان کے لیے۔

دعا کا یہ آہنگ ہم نے ان لوگوں میں کبھی نہیں دیکھا، جنہیں پاکستان کی بدولت وہ کچھ نصیب ہوا جس کے وہ نہ اس سے پہلے مستحق تھے اور نہ اس کے بعد اپنے آپ کو اس کا اہل ثابت کر سکے، کوڑیوں میں بکنے والے موتیوں کے تول تلنے لگے، متحدہ ہندوستان میں ''چپراس'' کا عہدہ رکھنے والے یہاں آ کر ''باس'' بن گئے اور انگریزوں کی چاکری کرنے والے یہاں افسری کرنے لگے، لیکن مجال ہے جو انہوں نے اس محبت، عقیدت، چاہت، وارفتگی، اور شیفتگی کے ساتھ اس پاکستان کے لیے کسی بھی

مرحلے پر دعا کی ہو جس پاکستان نے انہیں ''ککھ'' سے ''لکھ'' بنا دیا، ایسے لوگوں نے باتیں تو کیں، مگر سر بسر شکایتیں، دعا بھی کی تو باندازِ شکوہ، مراعات نہ ملنے کی شکایات، اور حسبِ منشاء عہدہ نہ ملنے کی شکوہ، یہ لوگ دہلی جائیں تو کہتے نظر آتے ہیں کہ اتنی عظیم سلطنت کو تقسیم کرنے کی کیا ضرورت تھی؟ لال قلعہ اور شاہی قلعہ میں فاصلے پیدا کرنے کی کیا حاجت تھی؟ ان سرحدوں کو ختم کر دینا چاہیے، یہ تقسیم مصنوعی تھی اور اب بھی عارضی ہے، یہی لوگ جب لندن اترتے ہیں تو کہتے نظر آتے ہیں کہ انگریز بہادر کا دور سنہری دور تھا، امن تو بس انگریز نے قائم کیا، اور خوش حالی صرف انگریزی عہد میں تھی، انہی لوگوں کو جب امریکہ کا ویزا ملتا ہے تو ان کے دل سے ہوک اٹھتی ہے کاش اس کے ساتھ ہی گرین کارڈ بھی مل جائے، یہ شکوہ سنج اور زودرنج لوگ کون ہیں؟ بے روزگار؟ نہیں، بلکہ شریکِ اقتدار! یہاں کی افسر شاہی کے ستائے ہوئے؟ نہیں، بلکہ دودھوں نہائے ہوئے! ستم رسیدگان و غم زدگان؟ نہیں، بلکہ اسمبلیوں کے ممبران اور مالدار سیاستدان! یعنی جن کی ساری شان و شوکت پاکستان کے دم سے ہے پاکستان بننے کا غم بھی انہی کو لاحق ہے، ایک طرف یہ نفسیات ہے اور دوسری جانب مولانا شاہ عبدالعلیم صدیقیؒ کی ذات ہے، کہ وہ 1892ء میں میرٹھ میں پیدا ہوئے، 14 اگست 1947ء کو پاکستان بنا اور 22 اگست 1954ء کو جنت البقیع (مدینہ منورہ) میں دفن ہوئے، ان کی عمر میں محض سات برس ایسے گزرے جن کا تعلق پاکستان سے بنتا ہے، مگر یہ سات سال بھی انہوں نے پاکستان میں نہیں گزارے، بلکہ انہوں نے اپنی کل عمر کا نصف سے بھی زائد یعنی 35 سال تبلیغ و اشاعت اسلام کے لیے مختلف ممالک میں بسر کیے، برما سے چلتے اور ملائشیا میں جا نکلتے، انڈونیشیا سے اٹھتے اور جاپان جا کر سامان کھولتے، چین سے نکلتے اور پرتگال جا پہنچتے، جنوبی افریقہ سے سامان سفر باندھتے اور کینیا پہنچ کر رختِ سفر کھولتے، آج فرانس میں ہیں تو کل برطانیہ میں، گرمیاں یوگنڈا میں گزرتیں تو سردیاں کانگو میں بسر ہوتیں، ایک ماہ امریکہ میں ہیں تو دوسرے ماہ کینیڈا میں، ایک چاند مصر

میں دیکھا تو دوسرا جنوبی افریقہ میں، خطہ حجاز تو ان کا وطن ثانی تھا، آپ نے سارے براعظم دیکھے، آپ شرق و غرب گھومے، دنیا بھر کی میزبانی سے لطف اٹھایا، لیکن دل نوزائیدہ اسلامی مملکت پاکستان میں اٹکا رہا، جن لوگوں کو ایک بار کسی دوسرے ملک کے ائیر پورٹ پر قدم رکھنے کا موقع ملا، ان کو سب کچھ یاد رہا مگر پاکستان بھولا رہا، اور ایک علامہ صدیقیؒ ہیں کہ جنہوں نے دنیا بھر کے شہروں، سمندروں، دریاؤں، صحراؤں اور ریگستانوں کو دیکھ کر بھی دل کے ارمانوں کا مرکز صرف پاکستان کو بنایا، پاکستان کی خیر مانگتے ہوئے ان کے ذہن میں یہ نہیں ہوتا تھا کہ ملک میں ان کی فیکٹریاں چل رہی ہیں، یا بنگلے بنے ہوئے ہیں، وسیع کاروبار ہے یا کوئی بڑا عہدہ ہے، بلکہ وہ اس ملک کی خیر اس لیے مانگتے تھے کہ یہ ٹکڑا اللہ و رسولؐ نے اسلامیان ہند کی جھولی میں خیرات کے طور پر ڈالا تھا، اور ہر گدا اپنے آقا کی خیرات کی قدر کرتا ہے۔

شاہ عبدالعلیم صدیقیؒ نے 46ء میں قیام پاکستان کے حق میں مہم چلائی، آل انڈیا مسلم لیگ نے ان کی قیادت میں ایک وفد سعودی عرب روانہ کیا، آپ نے اپنے تمام تر تعلقات کو بروئے کار لا کر پاکستان کے حق میں فضا ہموار کی، اس سلسلے میں مصر بھی گئے، اہل فلسطین کو قیام پاکستان کا فلسفہ سمجھایا، شام اور لبنان کا دورہ کیا، اُردن اور عراق تک اسلامیان ہند کا پیغام لے کر گئے، اس ساری جدوجہد کا مقصد یہ نہیں تھا کہ پاکستان بنے گا تو وہ "شیخ الاسلام" بن جائیں گے، بلکہ ما حصل یہ تھا جو ان کی دعا میں نظر آتا ہے، کہ ارض وطن، اسلامی دولت، اسلامی سلطنت اور الٰہی مملکت بنے، اللہ کا قانون اور اس کے احکام نافذ ہوں، دین کا علم بلند ہو، لیکن ہماری اجتماعی بد قسمتی اپنی جگہ پر ہے کہ جن لوگوں نے تحریک پاکستان کی فضا بنانے اور رائے عامہ ہموار کرنے کے لیے شرق و غرب کے فاصلے طے کر ڈالے، سردی گرمی کا احساس مٹا ڈالا، سفر و حضر کی کلفت و راحت کا مفہوم بدل ڈالا، پنجاب، بہار اور میرٹھ اور پشاور کے راستے روند ڈالے پاکستان بننے کے بعد ان کا ارادہ و عزم محض خواب بن کر رہ گیا مگر جن کے

پاؤں میں ایک کانٹا بھی نہ چبھا اور جن کا ایک دھیلا بھی نہ لٹا ان پر رنگین شباب آ گیا، لیکن عشق نے کب صلہ چاہا ہے؟ عشق میں خواب ہی تعبیر ہوتا ہے، حسن بذات خود عشق کا معاوضہ ہے، پاکستان بن گیا گویا سب کچھ مل گیا اور شاہ عبدالعلیم صدیقی کا عشق سرخرو ہو گیا۔

صلہ شہید کیا ہے تب و تاب جاودانہ

☆☆☆☆

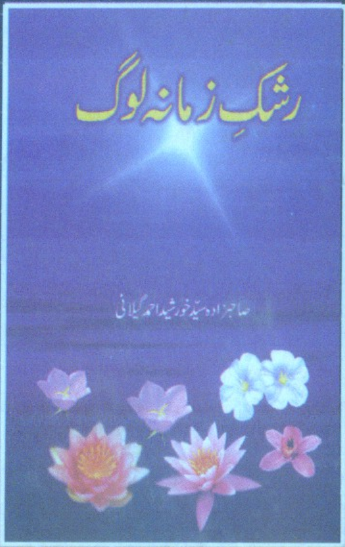

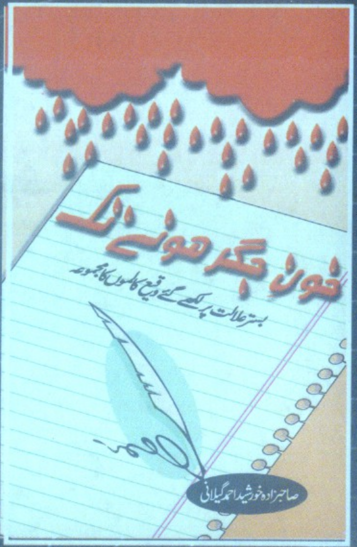

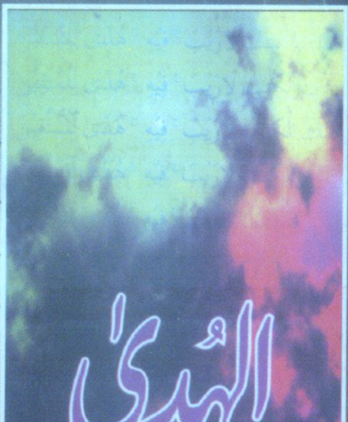

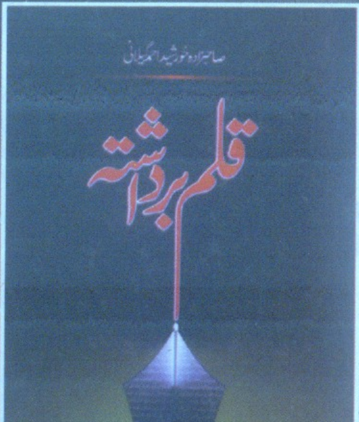

خورشید گیلانیؒ ٹرسٹ

22/H مرغزار آفیسرز کالونی، ملتان روڈ، لاہور۔